پیامِ امن

—— از ——

مولانا عبد الماجد دریابادی

ناشر: مولانا عبد الماجد دریابادی اکاڈمی رجسٹرڈ لکھنؤ

پیامِ امن

اسباب جنگ و تدابیر امن پر عقل و نقل، فلسفہ و مذہب کی روشنی میں محققانہ بحث
ایک فرینچ فلسفی کے خیالات کی ترجمانی، باضافہ تبصرہ و حواشی وضمیمہ جات،

— از —

مولانا عبدالماجد دریابادی
مفسر قرآن و مدیر صدق جدید لکھنؤ

ناشر:- مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی رجسٹرڈ لکھنؤ

- دوسرا ایڈیشن ـــــ پانچ سو
- ماہ اشاعت ـــــ اگست سنہ ۸۱ء
- طابع ـــــ نامی پریس لکھنؤ

ناشر

مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی

۸ - کچہری روڈ - لکھنؤ

زیر اہتمام

حسین قدوائی سکریٹری مولانا عبدالماجد دریابادی اکاڈمی

۸ - کچہری روڈ - لکھنؤ

- قیمت :- ۱۵ پندرہ روپیہ

فہرست مضامین

دیباچہ

(طبع ثانی)

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تالیف "پیام امن" کا پہلا اڈیشن ۱۹۲۳ء کے آخر میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا تھا اور بہت عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا۔ اس کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت اب مولانا عبدالماجد اکاڈمی کے زیر اہتمام (۵۸) اٹھاون سال کی مدت گزرنے کے بعد بلا کسی ترمیم و اضافہ کے ہو رہی ہے۔ صرف ٹائیٹل میں بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً پہلے اڈیشن کے ٹائیٹل میں عبدالماجد بی اے مصنف فلسفہ جذبات وغیرہ درج تھا۔ اس اڈیشن میں اس کے بجائے (مولانا) عبدالماجد دریابادی مفسر قرآن و مدیر صدق جدید درج کیا جا رہا ہے۔

اپنی اس کتاب پیام امن کے متعلق مولانا نے اپنی آپ بیتی میں ذیل کی عبارت تحریر فرمائی ہے۔

"اسی زمانہ میں ایک فرینچ فلسفی پال رچرڈ کی انگریزی کتاب TOTHENATIONS نظر سے گزری۔ عین جنگ کے خاتمہ پر مستقل پیام امن کی دعوت لے کر شائع ہوئی میں نے وہ اردو میں شروع ۱۹۲۰ء ہی میں اپنا لی اور پیام امن کا نام دے کر پھر

اس پر مقدمہ اور مفصل تبصرہ وغیرہ کا اضافہ کر کے اسے بجائے ترجمہ کے تالیف سے قریب تر کر دیا طبع و اشاعت کی نوبت ساڑھے تین سال بعد کہیں اخیر سنہ ۲۳ء میں آئی۔

واضح رہے کہ یہ کتاب مولانا کے اُس دور کی ہے جبکہ وہ گاندھی جی کی تحریک ترک موالات اور ان کے اصول عدم تشدد وغیرہ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اور بڑی حد تک وہ ایک عبوری دور سے گزر رہے تھے۔ اس لیے اس کے بعض ابواب مثلاً اسلام اور امن اور اسلام اور صبر میں ان کے قلم سے بعض ایسی چیزیں بھی نکل گئی ہیں جو تفسیر قرآن لکھنے اور صدق و صدق جدید کی ادارت کے زمانہ کی تحریروں سے خاصی مختلف ہیں۔ کاش وہ آج زندہ ہوتے اور یہ کتاب ان کی مکمل نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع ہو سکتی۔

اس کتاب میں ان کا جو اسلوب تحریر ہے وہ بھی ان کے بعد کے اسلوب تحریر سے ناظرین کو بہت کچھ مختلف نظر آئے گا۔ اس کتاب کا طرز بڑی حد تک ان کے فلسفیانہ دور کی کتب فلسفۂ جذبات وغیرہ سے ملتا جلتا ہے ـــــ ہر مصنف کے اسلوب تحریر میں اور پھر مولانا دریابادی کے سے مصنف جن کی تحریری خدمات کا سلسلہ ۶۴، ۶۵ سال تک مسلسل جاری رہا تھا کے مختلف زمانوں کی تحریروں میں اس قسم کا فرق پایا جانا ناگزیر ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں مولانا عبدالماجد اکادمی جناب عمار رضوی صاحب وزیر حکومت یوپی کی انتہائی ممنون ہے کہ ان کے توسط سے حکومت یوپی کی طرف سے قومی یکجہتی و اتحاد کی مد سے ایک گرانقدر رقم اس کتاب کی اشاعت کے لیے قبل اشاعت ہی مل گئی تھی۔

یہ اکادمی کی مطبوعات میں نمبر پانچ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حکیم عبدالقوی دریابادی

۱۴ر اگست سنہ ۱۹۸۱ء

اڈیٹر صدق جدید لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

(طبع اوّل)

میسو پال رچرڈ، زمانہ حال کے ایک ممتاز فلسفی، اہل قلم و صاحب فکر و بصیرت ہیں، وطن فرانس ہے، ابتداءً وہیں متعدد کتابیں شائع کیں، اس کے بعد مشرق کا سفر اختیار کیا، جاپانی و ہندی تمدن، معاشرت، و علوم سے دلچسپی شروع سے تھی، جاپان کے سفر متعدد بار اختیار کئے، ہندوستان آکر یہاں کے مائیہ ناز فلسفی و درویش آربندو گھوش کی صحبت سے خاص طور پر متاثر ہوئے، چنانچہ موصوف ہی کی معیت میں پانڈیچری (صوبہ مدراس) میں مستقل سکونت اختیار کرلی، اور موصوف کے ماہوار فلسفیانہ رسالہ آریہ کی تہذیب و ادارت میں شریک ہو گئے۔

عین دوران جنگ میں ایک کتاب اقوام عالم کو مخاطب کر کے شائع کی جس کا نام انگریزی میں "ٹو دی نیشن" ہے جس کا صحیح لفظی ترجمہ "الی الاقوام" ہو سکتا ہے، خیالات میں وطن دوستی کے بجائے عالم دوستی غالب ہے، اپنا وطن بجائے کسی خاص ملک کے سارے روئے زمین کو بتاتے ہیں، اپنا ہم وطن بجائے کسی خاص ملک کے باشندوں کے کل نوع انسان کو سمجھتے ہیں، جنگ کے قطعی دشمن ہیں، قتل و خونریزی کو ہر حال اور ہر صورت میں (خواہ وہ محض "تعزیر" اور "معاوضہ" ہو) ناجائز قرار

دیتے ہیں، آزادی ہر قوم کا فطری حق مانتے ہیں، جدید تمدن اور اس کے لوازم (مادیت، فقدان روحانیت، زرپرستی، نظام سرمایہ داری وغیرہ) کے سخت مخالف ہیں، ان تمام خیالات کا اظہار اس کتاب میں جابجا کیا ہے، تصنیف کا مقصد اصلی متحاربین کو جنگ سے روکنا، اور مستقل و پائدار صلح کی جانب دعوت دینا تھا، اس دعوت کو سب پر مقدم رکھا ہے۔

۱۹۱۷ء میں کتاب کی اشاعت امریکہ میں ہوئی، رابندرناتھ ٹیگور نے مقدمہ لکھا۔ دوران جنگ میں اس پیام صلح کا ہندوستان پہنچنا دشوار تھا، جاپان و امریکہ کی ڈاک پر سخت احتساب سرکاری قائم تھا، ایک عرصہ کے بعد کتاب ہندوستان آئی۔ اس کا ترجمہ (مگر لفظی نہیں) صفحات آیندہ میں پیش ہے۔

مسودہ سے آغاز ۱۹۲۰ء میں فراغت ہو گئی تھی، اشاعت کی نوبت ۱۹۲۳ء کی آخری سہ ماہی میں آرہی ہے، ساڑھے تین سال کی مدت میں کیا کیا موانع پیش آتے رہے اس کی تفصیل نہ راقم السطور کے لیے خوش گوار ہو سکتی ہے نہ ناظرین کے لیے ضروری ہے،

مجھے خود بھی اس بحث پر بہت کچھ کہنا تھا، سب کہنے کی گنجائش تو نہ نکل سکی، البتہ اہم تر عنوانات پر تبصرہ میں کچھ عرض خیال کیا ہے، آخر کے تینوں ضمیمہ بھی اصل کتاب میں نہ تھے۔ میں نے ان معلومات کا اضافہ کر دینا بہتر خیال کیا، کتاب کے نام میں بھی اصل کی پابندی نہیں کی بلکہ محض مفہوم کو لے کر پیام امن نام رکھا، اس تغیر و اضافہ کے ساتھ اگر اس مجموعۂ اوراق کو محض ترجمہ کے بجائے تالیف سمجھا جائے تو شاید واقعیت کے زیادہ خلاف نہ ہو۔

بعض مسائل میں مجھے جناب مصنف سے اختلاف ہے، مثلاً یہ کہ وہ قتل کو ہر صورت و بہر حال ممنوع قرار دے دینا چاہتے ہیں، میرے نزدیک شاذ صورتوں

میں قتل جائز اور شاذ صورتوں میں واجب ہو جاتا ہے، دنیا میں قتل سے بھی بڑھ کر ایک لعنت فتنہ، فساد و بدامنی کی ہے جو سرے سے حیات اجتماعی کی بیخ کن ہے۔ اگر اس کے روکنے کی کوئی صورت بجز قتل کے نہ نظر آئے، تو ایسی صورت میں قتل و قتال ایک اخلاقی فرض ہو جاتا ہے، البتہ یہ مخصوص صورت نادراً پیدا ہوتی ہے اور اس آخری حربہ کے استعمال سے پیشتر تمام امکانی تدابیر کا کافی تجربہ کر لینا چاہیے۔ اسلام نے بھی جو دنیا کے لیے بجائے خود ایک مستقل و ابدی "پیام امن" ہے، فتنہ و فساد کی معصیت کو قتل سے شدید تر قرار دیا ہے وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (بقرع ۲۴) وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (بقرع ۲۷) اور قتال کی غایت محض دفع جور و بدامنی ارشاد کی ہے، وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (بقرع ۲۴) اسی طرح بعض اور مسائل میں بھی مصنف کے قدم کو جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا پاتا ہوں، لیکن بحیثیت مجموعی اس کے اقوال اس قدر صحیح، صائب و دل پذیر ہیں، کہ اردو خواں جماعت کو ان سے محروم رکھنا ایک فرض فراموشی تھی۔

عبدالماجد

ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء

دریاباد۔ بارہ بنکی

مقدمہ

از۔ رابندر ناتھ ٹیگور

اقوام زندہ ہستیاں ہیں، ہر قوم اپنی ایک مستقل و جداگانہ شخصیت رکھتی ہو یہی سبب ہو کہ جرمن و فرنچ قومیں باوجود ایک دوسرے کے ہمسایہ ہونے اور بہت سی نسلی خصوصیات مشترک رکھنے کے باہم امتیازات بھی رکھتی ہیں، جو کسی طرح نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں،

لیکن حکومتوں پر زندہ ہستیوں کا اطلاق نہیں ہوسکتا، وہ محض نظامات قوتیہ ہوتی ہیں۔ یہی باعث ہے، کہ ان کے خصوصیات مادی و نفسی سب جگہ یکساں ہوتے ہیں۔ اور اُن میں جو کچھ فرق ہوتا ہو، وہ فرق صرف مدارج قوت کا ہوتا ہو، اگر کبھی اتفاقات سے انسانی شخصیت کو نشو و نما پانے اور برگ و بار پیدا کرنے کا موقع مل گیا تو حکومت کی گرفت ڈھیلی ہوجاتی ہو اور قوم کو تکملہ حیات کا موقع مل جاتا ہو، لیکن جہاں کہیں مادی نظامات کی جکڑ بند مکمل ہوئی وہاں حکومت ہی کا بول بالا رہتا ہو، دنیائے موجودہ میں قوموں کی زندہ روح اور حکومت منضبط کے طریقہ کار کے درمیان کشمکش برابر جاری ہو، اور یہ جنگ بالکل اسی طرح کی ہو جیسے ایشیا متوسط میں انسانی آبادی اور صحرا و ریگستان کے حدود کے درمیان ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر انسانی آبادی اور رونق کا وجود مٹ گیا اسی طرح جب

انسانیت کے بلند اصول پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں، تو نظام حکومت کی آہنی گرفت شدت دہنکیں کو پہونچنے لگتی ہو، تاآنکہ کچھ روز کے لیے وہ فخریہ اپنے تئیں سب کے توی اور قیام و بقا کے لیے "اصلح قرار دینے لگتی ہے۔

لیکن اس کا بقا انسان کے اُس حصہ کا بقا ہو جس میں زندگی سب سے کم ہی، اور یہی وجہ ہو کہ حکومت کی لاکھ توسیع ہو، تنوع و تازگی جو زندگی کے آثار ہیں کہیں نہ ملیں گے، بلکہ ان کے بجائے ہر جگہ یکسانیت و یک رنگی ملے گی۔ چنانچہ آج جو شہر بڑی بڑی حکومتوں کے مظہر ہیں، سین فرانسسکو سے لندن اور لندن سے ٹوکیو تک، سب ایک نمونہ کے، اور ایک قالب میں ڈھلے ملیں گے، ان کے چہرے کہیں نہ دکھائی پڑیں گے ان پر نقاب پڑے ہوئے ملیں گے، اقوام، بہ حیثیت زندہ اشخاص کے اپنے اظہار مدعا کے بھی طریقے رکھتی ہیں، اور اسی طرح وہ متعدد چیزیں خلق کر جاتی ہیں یہ تخلیقات کیا ہیں؟ علم و فن، حکمت و ادب، اور آداب معاشرت و رسوم، یہ چیزیں مختلف اقوام میں مختلف ہوتی ہیں، لیکن متضاد کبھی نہیں ہوتیں۔ جس طرح ضیافت میں انواع و اقسام کے کھانے ہوتے ہیں، اسی طرح ان چیزوں کا تنوع و تعدد ہمارے لطف کے زیادہ مواقع پیدا کرتا، اور حق شناسی میں معین ہوتا ہے۔ عالم انسانی میں حسن و لطافت عبارت انھیں چیزوں سے ہے۔

لیکن حکومتوں کا کام تخلیق نہیں، ان کا کام محض مادی پیداوار اور اس کی بربادی ہے۔ مادی پیداوار کے لیے نظامات قائم کرنا بے شبہ ضروری ہیں، اور بعض دفعہ ان کی تخریب و بربادی کے لیے بھی نظامات کا قیام ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ان کے محرک طمع و نفرت کے جذبات ہوتے ہیں، جب دنیا پر انھیں کی عملداری قائم ہو جاتی ہے، اور جب ان کے سامنے وہ زندہ انسانیت جو تخلیق کا کام کرتی رہتی ہو، ایک گوشہ میں ڈال دی جاتی ہے اُس وقت توازن درہم برہم ہو جاتا ہے اور حوادث انسانی کی برق رفتاری افتاں و خیزاں قعر ہلاکت کی طرف لے جانے لگتی ہے۔

انسانیت جس وقت تک زندہ ہو، ہدایت ضمیر برکار بند رہتی ہو۔ لیکن جب وہ قالب بے روح ہو کر ایک مشین رہ جاتی ہو، اس وقت ہدایات ضمیر کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہو، ایسی صورت میں اس میں نشو ونما کی قوت باقی نہیں رہ جاتی ہو۔ اب اس کے اعمال تعمیری تمام تر خارجی ہوتے ہیں۔ جو ہدایات باطن کی رہنمائی سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس تعمیر میں ہم پتھر پر پتھر رکھتے چلے جاتے ہیں، اور تازہ ترین سائنٹیفک معلومات کے مطابق ان پتھروں کو جوڑے جاتے ہیں، تاہم چونکہ اس عمارت کی اصلی بنیاد انسان کی زندہ روح پر ہوتی ہے، اور وہ ایک حد خاص سے زیادہ اس بار کو نہیں سنبھال سکتی، اس کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا ہے، کہ کوئی نہ کوئی سبب جو بہ ظاہر بہت خفیف ہوتا ہے اس کو جنبش دے دیتا ہو، اور یہ عظیم الشان عمارت ڈگمگا کر بالآخر زمین پر آرہتی ہو۔ پھر جس وقت یہ گرنے لگتی ہے، اس کو برقرار رکھنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی یہ عمل تخریب ہمیں ناگوار و مذموم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت تمام اخلاقی مواعظ و دانش مندانہ مشورے قانون کشش اخلاقی کو قیام توازن سے روکنے کی کوشش میں بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔

مدنی الطبع انسان کا نصب العین، بے غرضی ہوتی ہے، بہ خلاف اس کے حکومت کا نصب العین خود غرضی ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ فرد کے لیے خود غرضی مذموم سمجھی جاتی ہے، لیکن حکومت کے لیے اسے مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ اور اسی لیے دنیا میں یہ اخلاقی کور بصری کا مرض شائع ہو رہا ہو کہ حکومت کے مذہب اور قوم کے مذہب کو مرادف سمجھا جانے لگا ہو۔ چنانچہ آج مسیحیت کی افضلیت کا ایک بڑا ثبوت یہ پیش کیا جا رہا ہو کہ دنیا کا بڑا حصہ مسیحی حکومتوں کے قبضہ میں ہے۔ حالانکہ یہ بالکل ایسی ہی بات ہو کہ کسی

چور کے مذہب کی حقانیت پر اس امر سے استدلال کیا جائے کہ اس کے پاس چرائی ہوئی دولت کی اس قدر مقدار ہو! پھر حکومتیں، قتل و ہلاکت کے بعد جا کر اپنے اپنے معابد میں خدا کا شکر ادا کرتی ہیں. حالانکہ بعینہ اسی طرح ٹھگو کی جماعتیں قتل و سفاکی کو اپنی دیوی کا ارشاد بتاتی تھیں، اور کم از کم اس حیثیت سے تو ٹھگوں کو ترجیح تھی، کہ ان کی دیوی علانیہ خون کی دیوی تھی. درحقیقت وہ دیوی اس جرائم پیشہ گروہ کی جبلت خون آشامی و درشت سفاکی تھی، جس کی وہ دیوی کے نام سے پرستش کرتی تھی اور چونکہ اس جذبہ کا تعلق کسی فرد سے نہیں، بلکہ ساری جماعت سے تھا، اسی لیے اس کا اس قدر احترام و تقدس تھا ٹھیک اسی طرح موجودہ معابد میں قومی خود غرضی ہٹ دھرمی خود پسندی، و حرص و طمع کو اس عبادت میں شریک کیا جا رہا ہے جسے صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ سرشت انسانی میں ذمائم ودیعت کر دیے گئے ہیں، اور باوجود قوانین اخلاق پر اعتماد، اور ضبط نفس کی تعلیم کے بھی افراد بد اخلاقیوں کے مرتکب ہوتے رہیں گے، اور انہیں جس قدر کامیابی ہوتی جاتی ہے، اسی قدر ہمتِ عصیاں بڑھتی جاتی ہے،

نوع انسانی کی تاریخ میں ہمیشہ کچھ لوگ ایسے ہوتے رہیں گے جو تکلیف برداشت کیا کریں گے، اور کچھ ایسے جو دوسروں کو تکلیف دیتے رہیں گے اور بدی کا خاتمہ پوری طرح کبھی بھی نہ ہو سکے گا، بلکہ جس طرح شعلہ روشن رہتا ہے، اسی طرح پر ایک مسلسل کیفیت ہمارے تمدن میں بھی قائم رہے گی، مقصد آفرینش اس سے زائد اور کچھ نہیں، کہ لازوال مرتبہ معصومیت اور اس کے حصول کی عملی ناکامی کے درمیان جو نقص ہے اس کو رفع کیا

جاتا ہو لیکن جب تک نیکی کا نصب العین اس کی علامِ عملیت کے پہلو بہ پہلو قائم ہو جب تک اعمال بد نے احساس نیک کو بالکل فنا نہیں کر دیا ہو، اس وقت تک تکلیف واذیت کے باوجود سے زیادہ متردد ہونے کی وجہ نہیں۔

یہی باعث ہو گزشتہ زمانہ میں جب کبھی کوئی قوم آمادۂ شورش وفساد ہوئی، اور دوسروں کے حقوق اس نے غصب کرنے چاہے، تو خواہ اسے کامیابی ہوئی یا ناکامی، بہرصورت بات اس سے آگے بڑھنے نہ پائی لیکن آج جو حکومت کا تخیل قائم ہوا ہو، اور جو اس وقت ساری دنیا پر مسلط ہو، اس نے خودغرضی کو ایک فریضۂ اخلاق کی شکل میں پیش کیا ہے، محض اس لیے کہ یہ خودغرضی بہت بڑے پیمانے پر ہو۔ ایسی حالت میں یہ تخیل ہنگامی وعارضی بداخلاقیوں ہی کا محرک نہیں، بلکہ انسانیت کا اصلی دشمن ہے۔ یہ عقیدہ نفوس بشری میں چپکے چپکے قانون اخلاق کی مخالفت پیدا کرتا ہے، نفوس بشری کے سامنے یہ مسئلہ مختلف طریقوں سے بار بار پیش کیا جاتا ہے کہ حکومت کا مرتبہ قوم واشخاص سے بلند تر ہے، اور یہ وہی حکومت ہو جو اقوام کے مقدس ضابطۂ اخلاق کو قدم قدم پر ٹھکراتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں کہ مرض کی وہ حالت بہت ہی نازک ہوتی ہے، جب دماغ بھی متاثر ہو جاتا ہو، اس لیے کہ مقاومت مرض کے لیے دماغ ہی مرکز افواج قویٰ ہو قوم کا دماغی مرض اس میں ملکی وقومی خودغرضی کا پیدا ہو جانا ہے اور اس کی علامات یہ ہیں کہ آنکھیں غصہ سے سرخ رہتی ہیں۔ مٹھیاں کسی رہتی ہیں اور اقوال وافعال دونوں سے درشتی ٹپکتی ہے۔ جس کے باعث طبیعت اعتدال پر آنے نہیں پاتی۔ حیات معاشری کی اصلی روح قوت ایثار ہے یا ہمدردی ومعاونت کا جذبۂ اخلاقی، اس کا کام یہ ہو کہ اپنے اور ماحول کے

درمیان تطابق قائم رکھے۔ لیکن جس وقت یہ روح، قانون اخلاق کی عالمگیری سے منکر ہونے لگتی ہے، اور اسے ایک تنگ دائرہ کے اندر محدود سمجھنے لگتی ہے، اُس وقت اس کی طاقت تشنج عضلات کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے، جو صحت و اعتدال مزاج کی دلیل نہیں، بلکہ جس کا نتیجہ بالآخر خود اسی کے حق میں نقصان رساں نکلتا ہے'

اس سے بھی بڑھ کر ستم یہ ہے، کہ اقوام کے اس مرض اخلاقی کو "حُب وطن" کا مقدس لقب دیا جاتا ہے، اور اسی پُر شوکت لباس میں اسے ایک اعلیٰ اخلاقی جوہر سمجھا جاتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ مرض تمام عالم میں متعدی ہو گیا ہے۔ اور اس بخار کی تمتماہٹ کو دلیل صحت کامل سمجھا جانے لگا ہے۔ یہاں تک کہ اقوام کے ذہن میں، باوجود ان کی فطری آشتی پسندی کے رشک و حسد کا جذبہ پیدا ہوتا رہتا ہے، جب وہ یہ پاتی ہیں کہ خود ان کی حرارت کا پارہ اس قدر اونچا نہیں جتنا ان کے ہمسایوں کا ہے! اور ان کی قسمت میں صرف مظلومیت ہے، درآنحالیکہ دوسروں میں ظلم و ستم کی پوری قابلیت موجود ہے!

مجھ سے میرے مغربی احباب اکثر یہ دریافت کرتے رہتے ہیں، کہ آخر اس مہیب مرض کے دفعیہ کی تدبیر کیا ہے بلکہ بارہا مجھ سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ تم خطرات سے متنبہ کر کے الگ ہو جاتے ہو اور ان کا کوئی علاج نہیں بتاتے، اصل یہ ہے کہ نظام پرستی ہمارے نفوس میں اس قدر راسخ ہو گئی ہے، کہ جب کسی خاص نظام سے ہمیں تکلیف ہونے لگتی ہے تو ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ فلاں دوسرے نظام سے یہ تکلیف رفع ہو جائے گی لیکن ہم اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ تمام نظامات جلد یا بدیر تکلیف دہ ہو جاتے ہیں جس وقت کہ اس نفسیت میں جو ان کے عقب میں کام کرتی ہوتی ہے کوئی نقص واقع ہو جاتا ہے، آج نظام تومیت قائم ہے کل ممکن ہے یہ بین الاقوامی ہو جائے۔ لیکن جس وقت تک انسانی جذبات رذیلہ کی

پرستش ترک نہ کرے گا جس وقت تک خود بینی، طمع و حسد کو برا پیمانہ اختیار کرنے پر اور صاف اخلاقی سے تعبیر کیا جاتا رہے گا، اس وقت تک یہ جدید نظام، تکلیف انسانی کے لیے ایک جدید آلہ ہو گا، یا کم از کم یہ کہ اصلاح کے حق میں بالکل بے اثر رہے گا اور چونکہ اب تک ہم کارآمد نظام کو اعلیٰ اخلاق سے تعبیر کرتے رہے ہیں، اس لیے جہاں کوئی نظام ناقص ثابت ہوا، ہمیں اصول اخلاق ہی سے بے اعتباری ہو جاتی ہے

میں اسی لیے اپنے اعتقاد کی بنیاد کسی جدید نظام پر نہیں رکھتا، بلکہ ان اخلاقی غلاظتوں کی صفائی پر رکھتا ہوں جن سے نہ پہلے بخارات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور اس کے لیے ہماری نظر تلاش ہر قوم کے ایسے افراد پر پڑتی ہے، جو غور و فکر سے کام لینے والے ہوں، شریفانہ احساس رکھتے ہوں، اعمال صالحہ کے پابند ہوں اور اس طرح دنیا میں اخلاق و صداقت کی منادی ہوتی ہے، اس لیے کہ راستی پیدا ہو جانے کے بعد خود اپنی زندگی کا سامان کر لیتی ہے، اور اپنے راستہ سے خود بخود سب رکاوٹیں دور کرتی جاتی ہے۔ حیات اخلاقی اپنا راستہ ہتوڑیوں اور کھرپیوں کی مدد سے نہیں بناتی، بلکہ مناسب زمین پڑے ہوئے تخموں کی طرح اس کی جڑیں زمین کے اندر اندر اور شاخیں آسمان تک پھیلتی جاتی ہیں، اور یہ نقشہ کسی ماہر تعمیر کا بنایا ہوا نہیں ہوتا۔ اس زندگی کی شرط صرف یہ ہے کہ خیال، احساس، و ارادہ میں پاکیزگی رکھی جائے۔ باقی چیزیں از خود پیدا ہو رہیں گی۔

یہی باعث ہے، کہ جب میں جاپان میں میسو رچرڈ (مصنف "پیام امن") سے ملا، تو مجھے تمدن کے مستقبل سے متعلق اس سے کہیں زیادہ اطمینان ہوا، جتنا اُن بڑی بڑی تجویزوں اور منصوبوں کو سن کر ہوتا ہے، جو ارباب سیاست آئندہ امن عالم کے متعلق قائم کرتے رہتے ہیں، ہماری آئندہ نجات کا دار و مدار کثرت

تعداد یا ضخامت پر نہیں، بلکہ صداقت پر ہے، جو ممکن ہے دیکھنے میں بہت حقیر معلوم ہو، جس وقت ہلاکت کی عظیم الشان قوتیں جوش غضب سے بے خود ہو کر اپنا کام کر رہی تھیں، اس وقت میں نے شہرت و ناموری کے دائرہ سے باہر الگ تھلگ اس فرینچ نوجوان کو پایا جس کا چہرہ صبح سعادت کے انوار سے منور تھا، اور جس کی آواز میں حیات جدید کا تموج تھا۔ اور اس وقت مجھے یقین ہو گیا، کہ "طلوع سحر" کا وقت ہو چکا ہے، گو کسی سیاسی تقویم میں ہنوز اس کا اندراج نہیں ہوا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور
۱۷ر جنوری ۱۹۱۷ء

حصۂ اوّل

بابِ اوّل

نشۂ شب

اگر آج ہم راست گوئی پر آمادہ ہو جائیں تو؟..... اگر آج ہم اس
عالم مکر و فریب میں صاف گوئی سے کام لینے لگیں، اگر آج ہم بے کم و کاس
واقعات ہی کے بیان پر تُل جائیں تو؟......

لیکن آخر اس سے ہم ڈر کیوں رہے ہیں؟ کیا جو لوگ تاریکی کو روشنی
ترجیح دیتے ہیں، وہ تعداد میں بہت زائد ہیں؟ مکر و فریب کے اعمال ا
انھیں کے ہاتھوں میں چھوڑ دینے چاہئیں جنھوں نے اسے اپنا پیشہ بن
ہو، وہ لوگ بے شک کذب و حیلہ جوئی کے سہارے زندہ ہیں، لیکن دنیا
سے ہلاک ہو رہی ہے، اور ہلاک ہوتے ہوتے اب وہ اس طرز زندگی
عاجز ہو گئی ہے، وہ دن آ رہا ہے۔ جبکہ دنیا مکر و فریب کے دام سے اپنے
چھڑا کر اپنی آزادی حق و صداقت میں تلاش کرنے لگے گی، وہ دن دور نہ
جبکہ نوع انسانی بھیڑوں کی طرح ذبح ہوتے رہنے کی زندگی سے اُکتا کر ان لو
کے زیر علم آجائے گی جو حق و دیانت کو عزیز رکھتے ہیں۔

حق و صداقت کی آواز توپوں کی گرج نے ہر کان تک پہنچا دی ہے، آج کوئی کان اس سے نا آشنا نہیں، یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ حالتِ امن نے جن خرابیوں پر پردہ ڈال رکھا تھا، وہ سب ایک ایک کر کے مٹ رہی ہیں۔

حالتِ امن نے اب تک گویا بڑی قوموں کو چھوٹی قوموں پر مطلق الاختیار ہونے کی سند جواز دے رکھی تھی، اور بڑی قوموں کی اصطلاح میں قیام امن کے معنی یہ تھے کہ وہ بجائے باہم جنگ آزمائی کے جو بہر حال ایک پر خطر شے ہے کمزور قوموں کو پامال کرتی رہیں۔

واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ مشغلہ ہمیشہ نہیں جاری رکھنے کا بالآخر لازمی نتیجہ و ثمرہ یہی نکلتا تھا، کہ طاقتوروں میں باہم آویزش شروع ہو جائے۔

عادلِ حقیقی کی مشیت یہی ہے، کائنات گویا ایک بند دائرہ ہے، عمل و ردِ عمل کا قانون ہمہ گیر ہے، ہر عمل کے لیے پاداشِ عمل لازمی ہے "کہ کردہ نیافت" کا اصول ہر جگہ حاوی ہے، کوئی شے مٹنے نہیں پاتی۔ ہر جبر ایک دوسرے جبر کی تخلیق کرتا ہے جس طرح ایک لکۂ ابر کو دوسرے لکۂ ابر کی طرف کشش ہوتی ہے، اسی طرح ہر قوت دوسری قوت کا باعث ہوتی رہتی ہے، اسی کا ثمرہ ہے کہ یورپ جو مصائب بارہا دوسروں پر نازل کر چکا ہے، وہ آج خود اس پر مسلط ہو رہی ہیں، مصائب و نوازل کے یہ دل بادل جو خود یورپ کے پیدا کردہ ہیں، جن لوگوں نے فضا میں ان کے اجتماع کا اندازہ نہیں کیا تھا، وہ نابینا تھے۔

ان توپوں کے پیام کو حضرت اکبر رحمۃ اللہ نے اپنے مخصوص دلچسپ و دلنشین انداز میں کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے — غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام — یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

مُتحاربین میں سے کون سا فریق اس نقطۂ نظر سے اپنے تئیں معصوم و بے قصور کہہ سکتا ہو؟ ان میں سے کس کے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگین نہیں؟

اس وقت جتنی قومیں سرگرم آویزش ہیں، ان میں سے ہر ایک اگر بے تعصبی کے ساتھ اور خالی الذہن ہو کر غور کرے، تو ان تمام واقعات و حوادث کا جو بالآخر اس جنگ جہاں سوز تک منتہی ہوئے، سراغ بالکل منطقی و معقول ترتیب و تسلسل نتائج کے ساتھ اسے خود اپنے ہی اعمال میں نظر آئے گا۔

مثال کے طور پر ۱۹۱۱ء کے معرکۂ مراکو کو لیجئے، کیا جنگ طرابلس اس کا لازمی نتیجہ نہ تھی؟ پھر کیا جنگ طرابلس ہی ٹرکی کو کمزور کرکے جنگ بلقان کا پیش خیمہ نہیں ثابت ہوئی؟ اور پھر کیا جنگ بلقان ہی روس و اسٹریا کے درمیان رقابت پیدا کرکے جنگ جہاں سوز کا باعث نہیں ہوئی؟

آج جو قومیں بظاہر بے گناہ معلوم ہوتی ہیں، حقیقتہً ان میں سے کوئی ایک بھی بے گناہ نہیں، یہ سچ ہو کہ اس وقت بعض قوت و جبروت کو اپنا سب سے بڑا حربہ سمجھے ہوئے ہیں، اور بعض حق و استحقاق کے نعرے لگا رہی ہیں لیکن زبانوں پر خواہ کچھ ہی ہو، اہل نظر دیکھ رہے ہیں کہ ہر فریق کے پنجے شکار ہی کے تاک میں ہیں۔

ان کے دعووں کو سنئے تو معلوم ہو گا کہ مظلوموں کے حقوق کی حفاظت کرنے والوں کی تعداد اتنی زائد شاید کبھی بھی نہ تھی۔ ہر فریق اپنا مدعا یہی ظاہر کرتا ہو کہ وہ دوسرے فریق کے پنجہ سے کمزور و ناتواں قوموں کو رہائی دلانا چاہتا ہو، پولینڈ کو آزادی دلانے کے روس و جرمن دونوں یکساں بلند آہنگی کے ساتھ مدعی ہیں، البیس، آیرلینڈ، سرویا، مصر، بلجیم، ہندوستان ان سب کو آزاد کرانے کے بڑے بڑے زبردست وکلا موجود ہیں، اور اس میں شبہ نہیں

کہ یہ وکلاءِ حریت ایک دوسرے کو قتل و ہلاک کرکے، واقعتہً ان مظلوموں کی آزادی میں معین ہو رہے ہیں۔

یہ ہو اس تمام شورش کا اصلی باعث، یہ ہو اس جنگ کی حقیقی علت، بعض قومیں اپنے نفع کے لالچ میں بے شک جنگ کی خواہش مند تھیں۔ لیکن اس کی ذمہ داری، اور اس صورت حال کے پیدا کرنے میں جملہ اقوام مساوی شرکت رکھتی ہیں۔

یہ جنگ جہاں سوز لازمی نتیجہ ہو سیاسی خودغرضیوں اور ناجائز حُبِ جاہ کا ثمرہ ہو طماعی و بددیانتی کا اور قیمت ہو تمام قوموں کی شرمناک و منافقانہ انصاف کشی کی۔ اس لیے کہ آج تک یہ ساری قومیں (بعض علانیہ اور بعض خفیہ) برابر اپنے نفوس کے اندر ظلم و جبر، حرص و طمع کے عفریت کی پرورش کرتی رہی ہیں۔

یہ جنگ ان قوموں نے برپا کی ہو جو ملک گیری کی بھوکی ہیں، ان قوموں کے خلاف جن کی اشتہاء ملک گیری آسودہ ہو چکی ہو، ہر قوم کی اشتہاء مساوی درجہ کی نہ تھی، ہر قوم کی قوت تغذیہ میں بھی فرق مراتب تھا، لیکن اس قوت کو ترقی دیتے دیتے بالآخر سب کا اجتماع ایک نقطہ پر ہو گیا، سطح زمین محدود تھی، کہاں تک ان کے وسیع معدون کے لیے کافی ہوتی، جب اور کوئی باقی نہ رہا، تو انھوں نے آپس ہی میں ایک دوسرے کو اپنا طعمہ بنانا چاہا۔

روئے زمین کو مسخر کرکے انھوں نے جو مال غنیمت فراہم کیا تھا، یہ جنگ اس کی تقسیم کے لیے ہے۔ "دول عظمیٰ" کی مے نوشیوں اور بدمستیوں کا یہ آخری سماں ہو۔

یہ جنگ وہ سامان عبرت ہی، جو زمانہ حال، زمانۂ مستقبل کے لیے چھوڑ رہا ہو تاکہ آیندہ دنیا کو معلوم رہی کہ ذلت، بربادی و ہلاکت کا راستہ کون سا ہو۔

لیکن اس کے علاوہ اور بھی درس عبرت یہ جنگ اپنے اندر رکھتی ہے۔

بابِ دوم

خمارِ صبح

یہ جنگ نہ صرف طبعی اسباب کی بنا پر ناگزیر تھی، بلکہ اخلاقی قوانین کے لحاظ سے بھی اس کا وقوع لازمی تھا، کہنا چاہیے کہ مشیت غیبی کا منشاء بغیر اس کے پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

یورپ کی فضا پر مکر و کذب کی جو گھٹا چھائی ہوئی تھی، اس کے صاف کرنے کے لیے لازمی تھا کہ فن احتیال سیاسی (ڈپلومیسی) کا پردہ فاش ہو۔

بڑی بڑی قوموں کی بربادی لازمی تھی، اس لیے نہیں کہ ایک ظالم قوم کے پنجہ سے نکل کر دنیا دوسری ظالم قوم کی گرفت میں آجائے بلکہ اس لیے کہ دنیا کو ہوسناکی و ملک گیری کے عام استیلاء سے آزادی نصیب ہو۔

ہمارے سر بفلک قصر تمدن کا، جو از سر تا پا تصنع و ریاکاری کی بنیادوں پر قائم تھا، انہدام و انعدام ضروری تھا، تاکہ نوع انسانی کی رفتار ارتقائی کو وحشیانہ جبر و ستم اور دکانداری کی بندشوں سے رہائی حاصل ہو، اور انسانیت ترقی کا قدم بڑھا سکے۔

اس جہنم کا ایک بار برپا ہونا لازمی تھا کہ جو قومیں اس کی آفرینش کا باعث ہوئی ہیں انھیں تزکیہ حاصل ہو۔

اس غدر و شورش کا وقوع لازمی تھا، کہ جدید عمارت کے لیے سطح ہموار ہو اور ایک جدید زمین و جدید آسمان کی تخلیق ہو۔

جنگ کے اصلی اسباب و بواعث یہ ہیں نہ کہ وہ جن کے لیے فریقین مشغول آویزش ہیں، ہر فریق "اپنی" کامیابی کا یقین رکھتا ہے، اور یہی نشہ شب کا خمار صبح ہو، یہ جنگ تو باہمی بربادی و استیصال کی ہو۔ اس میں کسی فریق کی فتح و کامیابی کے معنی ہی کیا ہیں؟ جس قدر جان و مال کا اتلاف زیادہ ہوجاتا ہو۔ جس قدر یہ جنگ مع اپنے شدائد و مہالک کے طوالت پذیر ہوتی جاتی ہو۔ اس قدر کامیابی کا لفظ بے معنی ہوتا جاتا ہے۔

ابھی فریقین کو صدہا کامیابیاں ہولیں گی، جب جاکر ایک مشترک شکست سب کے نصیب میں آئے گی۔ جس فریق کا جتنا جی چاہے، اپنی فتوحات اور اپنی کامیابیوں کی اشاعت کرے، دنیا میں اس کا غلغلہ برپا کرے اور ان کو مشتہر کرکے خوشیاں منائے تاہم اس سے وہ آنے والا وقت نہیں ٹل سکتا جبکہ یہ سب قومیں خودکشی کرچکی ہوں گی اس لیے کہ اس جہاں سوز جنگ کا ہر روز خواہ اس میں کسی فریق کو کتنی ہی کامیابی ہو مجموعی تباہی و بربادی کے وقت کو اور قریب لاتا جارہا ہو دنیا پر غلبہ و استیلاء کے دعوے اب کی باطل ہوکر رہیں گے اتنی پیش گوئی تو ہر شخص کرسکتا ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی یقینی ہو کہ قوموں نے اپنی عادت قدیم کے مطابق اپنے منافع کے جو طامعانہ و حریصانہ اندازے لگائے ہیں وہ بھی اب کے پورے ہونے کے نہیں۔

اس جنگ سے جو کچھ بھی فتوحات و کامیابیاں کسی فریق کو حاصل ہوں گی

وہ وہ نہیں ہوں گی جو اس کی آرزوؤں کے مطابق ہوں گی بلکہ وہ ہوں گی، جو ان قوموں کی مجموعی بربادی کے باعث دنیا کے لیے پُر منفعت ثابت ہوں گی۔

دول متحاربہ کی حکومتیں ایک طرف تو اپنی اپنی کامیابی و فتح مندی کا سراب دکھا رہی ہیں اور دوسری طرف خود ان کا نفس اس سے بھی بڑھ کر اس دھوکے میں مبتلا ہے، کہ خاتمہ جنگ پر پھر زمانۂ قبل جنگ کے حالات عود کر آئیں گے، اور پھر وہی نفسیت جاری و ساری ہو جائے گی۔ وہ اس خیال میں مست ہو رہے ہیں کہ اختتام جنگ پر پھر انھیں اپنی رنگ رلیوں اپنے محبوب مشاغل سے محظوظ ہونے کا موقع ملے گا۔ وہ اس حماقت میں گرفتار ہیں کہ جس طرح امن گزشتہ کل تک قائم تھا، وہی آئندہ کل پھر قائم ہو جائے گا۔ یہ خود فریبی بعینہٖ اسی درجہ و مرتبہ کی ہے کہ جیسے دور گزشتہ میں وہ برابر یہ سمجھتے رہے کہ اپنے تئیں اس دور ہلاکت سے محفوظ رکھ سکیں گے، در آنحالیکہ وہ خود ہی اپنے طرز عمل سے اس کا سامان فراہم کرتے رہے۔

سو یہ نہیں ہونے کا۔ ماضی و استقبال کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے سیل دریا اپنا رخ نہیں پھیر سکتا۔ اور یہ جنگ ان نادانوں کو جہاں یہ چاہتے ہیں وہاں نہیں لے جانے کی۔

کیا وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ واقعات و حوادث جو اس وقت روئے زمین میں زلزلہ پیدا کئے ہوئے ہیں مستقبل کے لیے بالکل عبث رہیں گے؟ یا وہ عظیم الشان تجربہ جو اس وقت اقوام کو حاصل ہو رہا ہے، اس سے وہ غیر مستفید رہیں گے؟ یا دوسرے اس درس عبرت سے بالکل غیر متاثر رہیں گے؟ یا یہ سیل معاصی و جرائم، یہ اقوام کا غسل خونیں، یہ ظلم و شقاوت، یہ مظلومیت و

بے بسی، یہ سب چیزیں بالا بالا چلی جائیں گی؟ کیا یہ سارے انقلابات محض اس لیے ہوئے ہیں، کہ کل آیندہ ان لوگوں کو اپنے ان اعمال کی پھر فرصت حاصل ہو جائے گی، جن میں وہ کل گزشتہ تک مشغول تھے۔

خود فریبیوں اور نادانیوں کا زمانہ ختم ہو چکا۔ جو صلح ہونے والی ہے۔ وہ خود غرضیوں پر مبنی نہ ہوگی، اس لیے کہ یہ جو باہمی جنگ چھڑی ہے۔ یہ جنگ جو دول عظمی کے درمیان ہو رہی ہے، دراصل وہ جنگ ہے جو سب سے ارفع و برتر قوت، ان کل قوتوں کے خلاف مجموعًا کر رہی ہے۔

لیکن یہ جنگ جس طرح سب کے معاصی کا نتیجہ ہے، اسی طرح سب کی اصلاح و ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ متحادبین مشیت غیبی کے سامنے بے بس تھے جس کا منشا ان سب کو سزا دینا تھا، ان میں سے بعض اس وقت حق و انصاف کی آڑ پکڑ رہے ہیں مگر یہ بالکل بے سود ہے وہی حق و انصاف جسے وہ ہمیشہ پامال کرتے رہے وہ آج خود انھیں موت و ہلاکت کے غار میں ڈھکیل رہا ہے اور اس جہنم سے انھیں نجات اسی وقت مل سکتی ہے۔ جب وہ اپنی زندگی میں عدل و صداقت پیدا کریں۔

یہ جنگ کسی نہ کسی شکل کے ساتھ یا اس جنگ کے بعد ایک سلسلۂ جنگ کے ساتھ برابر جاری رہے گی، تا آنکہ بدکاری و تخریب کا وہ دیوتا جس نے اتنے دنوں نفس بشری کے اندر نشو و نما پائی ہے، رحم کی التجا کرنے پر مجبور ہو جائے۔ تاکہ اس کے مٹنے کے بعد باہمی خدمت و اعانت کا جدید دور پیدا ہو، نفرت و عداوت کا دیوتا اگر یوں نہ سرنگوں ہوا، تو یقینًا یہی شعلۂ جنگ جو یورپ میں بھڑکا ہے، فردًا فردًا یورپ کے ہر ملک میں بھڑکے گا اور ممکن ہے کہ روئے زمین کا کوئی گوشہ اس سے محفوظ نہ رہ سکے، تاہم جب تک اس کا مقصد پورا نہ ہوئے گا، وہ برابر

قائم رہے گا، اور وہ مقصد یہ ہے کہ قوموں کے دلوں میں انسانیت کا درد، انسانیت کا احساس پیدا ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح کوئی قوت اس شعلہ کو بھڑکنے سے باز نہ رکھ سکی، اسی طرح اب تک کوئی تدبیر اس کے بجھانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکی ہے تمام دنیا کا مصائب و نوازل میں گرفتار ہو جانا، بلا سبب اور بے معنی نہیں ہو سکتا تھا۔

واقعات و حوادث پر اس حیثیت سے نظر کیجئے، جب جا کر سمجھ میں آئے گا اُس وقت خود غرضانہ و نفس پرستانہ تعصبات کا پردہ فاش ہو گا، اس وقت اس شئے پر نظر پڑے گی جو نگاہوں سے مخفی اور تمام ظواہر کے عقب میں ہے۔ اور اس وقت مستقبل کی وہ "حقیقت منتظر" منصۂ شہود پر آئے گی، جو اس وقت تک ماضی و حال کے مجاز میں مستور رہی ہے، اس مستقبل سے کیا مراد ہے، وہ قوت یا وہ ذات جس کے بار قدم نے کرۂ ارض کے جسم پر لرزہ پیدا کر دیا ہے۔

باب سوم

حقائقِ فردا

طلوع فردا، یعنی تاریکیٔ شب کا طلوع سحر کی طرف بڑھتا ہوا ایک اور قدم قعر مذلت سے بام ترقی تک لے جانے والے راستہ کا ایک اور زینہ، ہاں راستہ کی وہ چڑھائی جسے انسانیت زخمی اور خوں فشاں پیروں کے ساتھ طے کر رہی ہے،

یہ طلوع فردا ناگزیر ہے، حقائق مستقبل پر نظر نہ عامیانہ رجائیت[1] رکھتی ہے، نہ عامیانہ یاسیت[2]، یہ دونوں اپنی پست قامتی کے باعث پیش آیند واقعات کو نہیں دیکھ سکتیں مستقبل اتنے فاصلے پر ہوتا ہے کہ وہاں تک شخصی یا قومی خود غرضیوں کی محدود نظریں پہنچ ہی نہیں سکتیں، دور دور کی چیزیں صرف انھیں کو نظر آسکتی ہیں جو کسی بلند مقام پر ایستادہ ہوتے ہیں۔

---

[1] "رجائیت" ترجمہ ہے optimism کا جو اس ذہنی کیفیت کا نام ہے جس کی بنا پر انسان ہر شے کے متعلق خوش آیند و مسرت آمیز توقعات رکھتا ہے۔ م

[2] "یاسیت" ترجمہ ہے pessimism کا، جو رجائیت کی ضد ہے۔ یعنی وہ کیفیت ذہنی جس میں انسان ہر شے کو مایوسی و حسرت کی عینک سے دیکھتا ہے۔ م

کل کیا ہو گا؟ غالباً کل جنگ ختم ہو جائے گی، لیکن اس سے دنیا کے مصائب کا خاتمہ ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کے اشتداد میں اور اضافہ ہو جائے گا شعاع نور کی جھلک تک نظر نہیں آ سکتی، تا وقتیکہ انتشار و ابتری حد کمال تک نہ پہنچ جائے، تا آنکہ فضا میں انتہائی تیرگی نہ چھا جائے، نامۂ اعمال کی سیاہی جب تک بالکل کامل نہ ہو جائے ظہور نور کا وقت نہیں آ سکتا، اور تیرگی و سیاہی کا کامل و مکمل ہونا باقی ہے۔

یہ جنگ تو محض ایک مقدمہ یا تمہید ہے۔ اور اس کا خاتمہ، خواہ وہ کسی صورت میں بھی ہو، مقصود بالذات نہیں ہو سکتا۔ یہ تمہید جس متن کی ہے، اس کا آغاز اس جنگ کے خاتمہ پر ہو گا، وہ وہ واقعات و حوادث ہوں گے جو مقصد جنگ کی تکمیل کریں گے۔

بے شبہ یہ بالکل ممکن تھا کہ کوئی سوء اتفاق ان واقعات کو ان کی پختگی تک پہنچنے سے قبل ختم کر دیتا۔ لیکن ایسا سوء اتفاق نہیں پیش آیا، اس لیے اب ان واقعات کا رونما ہونا اسی قدر ناگزیر ہے، جیسے خود یہ جنگ تھی۔ وہ اس صورت حال کے منطقی و لازمی نتائج ہیں، اور جب کوئی قوت جنگ کے روکنے میں نہ کامیاب ہو سکی تو اس کے لازمی نتائج کو ظہور پذیر ہونے سے کون قوت باز رکھ سکتی ہے؟ ان نتائج میں سے بعض کی بابت ابھی قطعیت کے ساتھ حکم لگایا جا سکتا ہے، اور اس سے زیادہ وثوق و قطعیت کے ساتھ جتنا کہ اس جنگ کے خاتمہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ جس طرح یہ جنگ بہ ظاہر دفعتہً خود بخود چھڑ گئی، اسی طرح یہ یک بیک ختم بھی ہو جائے، اگر آسٹریا کے شہزادہ کا قتل اس جنگ جہاں سوز

کے آغاز کا باعث بن گیا، تو کیا عجب ہو کہ اسی درجہ کا کوئی معمولی واقعہ غیر متوقع طور پر اس کے اختتام کا بھی باعث بن جائے۔

ساتھ ہی اس کا بھی امکان ہے کہ خاتمہ جنگ کا جو مفہوم عموماً سمجھا جاتا ہو اس معنی میں جنگ ختم ہی نہ ہو، اور بجائے نام نہاد حالت صلح کے جیسا کہ اب تک قائم تھی، ایک مستقل پائدار حالتِ جنگ ہی قائم ہو جائے، جس میں ہر فریق ہر وقت دست بر قبضۂ شمشیر رہے، جیسا کہ اس وقت بھی ہے،

غرض جو صورت بھی پیش آئے اتنا بر حال یقینی ہی، کہ اس جنگ کا خاتمہ مثل محاربات سابق کے نہ ہوگا، اور اس کا خاتمہ جب ہی ہوگا کہ موجودہ نظام معاشرت وتمدن ہی ختم ہو جائے، اس لیے اس جنگ کا سلسلہ اس وقت تک یقیناً قائم رہیگا جب تک اس کا احتمال نہ مٹ جائے کہ موجودہ صورت حال پھر عود کر آئے گی۔

جنون جس سرعت سے طاری ہوتا ہے، اس تیزی سے جاتا نہیں قضائے آلٰہی جو اقوام یورپ کی بربادی کا فیصلہ کر چکی تھی اس نے پہلے ان لوگوں کی عقلیں خبط کر دیں، جو جنگ کے آرزو مند تھے، اور اسی تقضائے آلٰہی نے اب ان اشخاص کی عقلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے، جو لڑائی کو فتح مندی سے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں نے صلح کے خلاف ایک دوسرے سے معاہدہ کر کرکے اپنے اپنے ہاتھ خوب مضبوط کس رکھے ہیں اور اس طرح فریقین نے اپنا ایسا توازن قوت قائم کر رکھا ہے، جو ہر قسم کے صدمہ کی برداشت کر سکتا ہے، جا بجا اس میں رخنے پڑ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا درہم برہم ہونا دشوار ہے، اس کی زندگی عرصہ تک قائم رہ سکتی ہے۔

اس کے علاوہ جوں جوں جنگ کو طوالت ہوتی جاتی ہو۔ اس کے

مزید قیام کے اسباب بھی قوی ہوتے جاتے ہیں، اس معنی میں کہ جو فریق اب تک کچھ کامیابیاں حاصل کر چکا ہے، وہ ڈر رہا ہے کہ کہیں صلح ہو جانے سے اسے ان جدید مفتوحہ علاقوں سے دست بردار نہ ہونا پڑے اور جنھیں اب تک ناکامیاں ہوئی ہیں، وہ برابر اس فکر میں ہیں کہ ذرا اور جوانمردی دکھا کر ہاتھ سے نکلی ہوئی چیزیں پھر واپس لے لیں، غرض غالب و مغلوب قوی و کمزور دونوں جنگ کے طلب گار ہیں، اور اس طرح لڑائی جتنی بڑھتی جاتی ہے، اتنا اس کا خاتمہ اور دور ہوتا جاتا ہے،

تاہم ابھی تک ہر فریق کو امیدیں اور تمنائیں ہیں، لیکن اگر ان امیدوں اور تمناؤں کی جگہ مایوسیاں اور حسرتیں لے لیں، تو کیا خاتمہ جنگ کچھ بھی قریب ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں،

طوالت جنگ کے حق میں جو سبب سب سے قوی مانع ہو سکتا تھا، وہ اقوام کی اقتصادی ناداری تھی، لیکن اقوام متحاربہ اس مانع قوی پر بھی بہ آسانی غالب آ گئیں۔

آغاز جنگ کے وقت متعدد ماہرین اقتصادیات نے پیشین گوئی کی تھی کہ جنگ کی مدت چند ماہ سے زائد نہیں رہ سکتی ورنہ فریقین بالکل تباہ ہو جائیں گے، ان ماہرین فن کا اندازہ حالات اقتصادی بالکل صحیح تھا، لیکن ان کا یہ خیال قطعاً غلط تھا کہ تباہی و بربادی کا یقین ان اقوام کو سالہا سال تک مشغول جنگ رہنے سے باز رکھے گا انھیں اختیار ہے کہ جتنے زور سے جی چاہے یہ صدائیں بلند کرتے رہیں کہ "صلح کرو ورنہ برباد ہو جاؤ گے" لیکن ان آوازوں پر کوئی قوم نہیں کان رکھنے کی۔ صلح و جنگ کے انتخاب

کا وقت اب ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے، تباہ و برباد تو تمام اقوام اچھی طرح ہو چکیں، اور جتنا ان کو احساس ہے اس سے کہیں زیادہ تباہی کی نوبت آ چکی ہے۔ لیکن یہ تباہی ہرگز انہیں عزائم جنگ سے باز رکھنے کی قدرت نہیں رکھتی، بلکہ برعکس اس کے یہی تباہی انہیں اور زیادہ درازئی جنگ پر مجبور کر رہی ہے، ہر فریق کا جتنا زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ اسی تناسب سے وہ اور زیادہ جان پر کھیلنے کو تیار ہو رہا ہے،

یورپ کی حکومتیں جتنا زیادہ تباہی کے انتہائی سرے کے قریب ہوتی جاتی ہیں، اسی قدر شکست پذیر قمار باز کی طرح ان کی جانبازی اور بڑھتی جاتی ہے، جب تک ان کے ہاں کچھ آدمی بھی جان دینے کے لیے موجود ہیں، ان کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل اپنی اپنی خندقوں کی حفاظت کے لیے برابر تیار ملیں گی۔ اس لیے کہ اب سوال محض جنگ کا نہیں، بلکہ ان کی زندگی و موت کا سوال ہے، وہ خوب جانتی ہیں کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی انھیں اپنی اپنی رعایا کے سامنے نہ پوری ہونے والی آرزوں اور نہ ایفاء ہونے والے وعدوں کے متعلق جواب دہی کرنا ہو گی۔ ہر حکومت اس یوم احتساب کو ملتوی رکھنے کی فکر میں ہے۔ اور اس میں کامیاب ہوتی رہے گی۔ جب تک اس کی رعایا میں کچھ لوگ بھی اپنی جان دینے کیلئے آمادہ باقی رہیں گے۔

طلوع فردا، ہر ملک کی غریب و مظلوم رعایا کی دادرسی کے لیے ہو رہا ہے۔

لیکن فرض کرو کہ اسی اثنا میں کسی حیرت انگیز حربی یا سائنٹفک ایجاد کی مدد سے یا کسی خاص شیطانی تدبیر کے انکشاف سے، یا کسی غیر معمولی و غیر متوقع

حادثہ کی بنا پر ایک فریق دوسرے کو مسخر کرے، تو بھی کیا جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا؟ یا یہ کہ جبتک جنگ آفرین اسباب باقی رہیں گے اسوقت تک جنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، وہ مرے گی اور اپنی نعش سوختہ سے پھر دوبارہ زندہ ہو گی۔ ایسی حالت میں صلح اگر ہوئی، تو وہ صلح نہ ہو گی، بلکہ محض مہلت سامان جنگ ہو گی۔ یہ وہ وقفہ ہو گا جس میں مزید محاربات کی تیاریاں کی جائیں گی، اور محاربات غالباً ان کے درمیان ہوں، جو کل تک ایک دوسرے کے حلیف اور زمرہ اتحادئین میں تھے تباہ شدہ مسلح اقوام جس وقت باہمی حساب کرنے بیٹھتی ہیں، اس وقت سے بڑھ کر خطرناک وقت اور کوئی نہیں ہوتا۔

پھر اتحادئین کے علاوہ بھی دنیا میں کچھ اور مسلح و آمادۂ جنگ قومیں ہیں، دنیا میں نفسانیت، انانیت، حرص و ہوس و دیگر جذبات سے بھری ہوئی کچھ اور قومیں بھی ہیں۔

یہ دول عظمیٰ کی برادری سے خارج پست و مظلوم قومیں ہیں جو ساعت انتقام کے انتظار میں ہیں۔

فردائے موعود! اس کا طلوع انہیں اقوام کے لیے ہو گا، جو چیزیں آج فنا ہو رہی ہیں، وہ اس روز سب ختم ہو چکی ہوں گی اور اس وقت سے دنیا گویا نیا قالب بدلے گی۔

باب چہارم

آہِ مظلومان

منازلِ ترقی کے طے کرنے میں نسلِ انسان کے ساتھ اقوامِ یورپ کو وہی تعلق رہا ہے جو گلہ کے ساتھ پاسبان کتّوں کو رہتا ہے، ان اقوام نے سگانِ پاسبان کے فرائض پوری مستعدی و سختی سے انجام دئے سرعت رفتاروں کے لیے ان کے قلوب رافت ورحمت کے جذبات سے خالی رہے ہیں۔ زندہ اجسام کے گوشت میں ان کے دانت خوب پیوست رہا کئے ہیں، اور اگر اس جماعت سگان میں خود ہی باہم پھوٹ نہ پڑ جاتی تو ان کی قوتِ خونخواری کا معلوم نہیں کیا انجام ہوتا۔

اگر یہ سگ طبع اقوام باہم متحد رہتیں تو تمام دنیا ان کے دام میں اسیر ہو جاتی، اور سب کے قوائے عمل مضمحل بلکہ مفلوج ہو کر رہ جاتے

کیا ہم اس واقعہ کو بھول گئے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں پیکنگ (چین) میں ان "متمدن اقوام" کی افواج متحدہ نے جرمنی کی سرکردگی میں اپنی

سبعیت و بہیمیت کے کیسے کیسے ثبوت دیے تھے، درآنحالیکہ آج انھیں افعال واعمال پر وہ جرمنی کو لعنت وملامت کر رہے ہیں؟

اس وقت اس کا امتحان تھا، کہ یورپ میں تمام دنیا پر حکمرانی کی کس حد تک اہلیت ہے۔ لیکن وہ اس امتحان میں ناکام ثابت ہوا، شائستگی وتمدن کی خدمت اس کا نصب العین تھی۔ مگر اس کی قوت اس کے حق میں وبال ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوت شکست ہونے لگی۔ اس میں رخنے پڑنے لگے، یہاں تک کہ اس کا توازن قوت پارہ پارہ ہوگیا تاکہ دنیا کا توازن قائم رہے۔

رفتار کائنات میں اقوام کی مثال کبھی اس دست وبازو کی ہوجاتی ہے، جو وار کرتا ہے، اور کبھی اس زندہ گوشت کی رہتی ہے جو تکلیف و کرب سے آہ کرتا ہے، ان میں باہمی فعل وانفعال کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے، اور اپنی اپنی نوبت میں ہر قوم آقا وغلام بنتی رہتی ہے[1]۔ اپنی اپنی نوبت کی قید اس لیے کہ کوئی قوم ہمیشہ آقا یا ہمیشہ غلام نہیں رہ سکتی، نجات کا ایک نہ ایک دن سب کے لیے آتا ہے،

موجودہ جنگ بھی نجات ورہائی ہی کی جنگ ہے۔ البتہ ان الفاظ کا مفہوم وہ نہیں جو متحاربین کے دلوں میں ہے، یہ لوگ بعض چھوٹی قوموں کی آزادی دلانے کے تو مدعی ہیں، اور حال یہ ہے کہ خود ان کے پنجۂ اسیری میں بڑی سے بڑی انسانی آبادیاں پھڑپھڑا رہی ہیں؟ ان میں سے ہر حکومت اپنے حریف کی شہنشاہیت وہوس ملک گیری کا زور توڑنے کی

---

[1] تلک الایام نداولہا بین الناس (م)

...میں ہے اور اپنی طرف کوئی نہیں دیکھتا، بلکہ لطف کی بات یہ ہے کہ ...تو میں اپنی آزادی و خودداری کو سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں، ...ہی دوسروں کی آزادی و خودداری کو پامالی کرنے میں سب سے پیش پیش ...ہیں۔

یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ جنگ یورپ کی چھوٹی ...چھوٹی مفتوح قوموں کو آزادی دلا دے گی تاہم اس قدر بالکل قطعی ...ہے کہ ایشیا اور افریقہ کی بڑی بڑی مفتوح قوموں کی آزادی و خاتمہ ...اسیری کا زمانہ روز بروز قریب آرہا ہے۔

کیا دنیا میں وہ بڑی قوم اپنی مستقل زندگی، اپنی آزاد زندگی کو مطلق ...عزیز نہیں رکھتی جو عربی النسل ہے۔ اور عربی زبان بولتی ہے، اور جسے ...اس قدر بلند آہنگی کے ساتھ ترکوں کی ماتحتی و محکومیت سے آزادی دلائی ...گئی ہے؟ ہاں وہ وسیع قوم جسے نہ صرف اتحاد مرز بوم بلکہ اتحاد مذہب نے ...بھی بحر اوقیانوس سے لے کر بحر قلزم اور بحر قلزم سے لے کر خلیج فارس تک مایوسیوں ...اور ناکامیوں کے ایک رشتہ میں منسلک کر دیا ہے،

مصر، عرب، طرابلس، مراکو، وغیرہ کی تمام آبادیاں صرف ایک لیڈر ...ایک مرد بزرگ کے ظہور کی منتظر ہیں جو آئے اور انھیں ایک قوم بنا دے، ...ہر قوم میں ایسے لیڈر کا ایک نہ ایک دن پیدا ہونا لازمی ہے، وہ پیدا ...ہوتا ہے، اور پیدا ہوتا رہتا ہے تاآنکہ اسے پوری کامیابی حاصل ...ہو جائے،

رہا ہندوستان، تو کیا وہ مادر ہند جس نے دنیا کی ہر قوم کی رضاعت ...کی ہے، کیا عنقریب وہ آزادی سے مستفید نہ ہو گی۔

یہ تمام اقوام گو باہم کتنے ہی مختلف ہوں، تاہم مظلومیت کے اشتراک نے سب کو متحد کر دیا ہے۔ قالب گو مختلف ہیں، لیکن ایک ہی روح اس وقت سب میں کام کر رہی ہے، اور وہ روح کیا ہے؟ عظمت ماضی و آزادی مستقبل کا احساس، یہ جدید روح اس حقیقت کا علم رکھتی ہے کہ وہ روز سعید جس کا ایک صدی سے انتظار تھا۔ کل طلوع ہونے والا ہے اس یوم احتساب اس روز نجات کی آمد کو ان طریقوں سے روکنا بالکل لاحاصل ہی، کہ ان اقوام کی کتاب مقدسہ کا مطالعہ ممنوع قرار دے دیا جائے، بھگوت گیتا کا مطالعہ کرنے والوں کو نظر بند کر دیا جائے اور ان کے ہاں کے حکماء وقت کو جرائم پیشہ قرار دے دیا جائے۔ قسمتوں کا فیصلہ جو ہونے والا ہے، ہو کر رہے گا، وہی ساعت صبح سعادت کے اصلی طلوع کی ہوگی، اور سعادت تمام اقوام کے لیے۔

اس کے بعد جو دور جدید قائم ہوگا، اس میں جوان عمر اقوام کو برابر اس کا احساس رہے گا کہ کم عمر قوموں کے ساتھ تحقیر اور ضعیف العمر قوموں کے ساتھ بیدردی کا برتاؤ کرنا درست نہیں۔

اس وقت کوئی کانگو، بلجیم کے ماتحت[۱] نہ ہوگا۔

یہ کیونکر ممکن تھا کہ یورپ جو تمام دنیا کو اپنی غلامی میں لا رہا تھا، خود اس کے ہاں غلام نہ ہوں؟ قدیم غلام تو تھے ہی، جدید غلام خود یورپ کی سر زمین پر بھی پیدا ہو گئے۔ گیا زمانہ کی نیرنگی ہے، کہ یہ جنگ جو آزادی کے لیے برپا کی گئی۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا، کہ جو قومیں اب تک یورپ میں آزاد تھیں،

---

[۱] کانگو، براعظم افریقہ کا وہ علاقہ، ہی جو مدتوں، بلجیم کے شدید مظالم کا ہدف رہ چکا ہے۔

وہی غلامی کے دائرہ میں آگئیں!

جنگ کا آغاز سردیا کی حمایت میں ہوا، لیکن سردیا کو اس حمایت و ہمدردی کی آڑ میں جن مصائب و مظالم کا ہدف بننا پڑا، کیا بغیر اس جنگ کے بھی اس کی قسمت میں یہی ہوتا؟ اوس کی گزشتہ تاریخ میں تو اس کی نظیر نہیں ملتی۔

رحمت کی گھڑی ان گرفتاران جدید و قدیم سب کے لیے آئے گی مگر یہ گھڑی کس وقت آئے گی؟ اس وقت نہیں، جب ان مظلوموں کے باضابطہ ہمدرد انھیں بیرونی غنیموں سے نجات دلائیں گے۔ بلکہ اس "طلوع فردا" کے وقت جبکہ یورپ کی ظالم و مظلوم تمام اقوام اپنے اس اندرونی مشترک دشمن کے پنجے سے رہائی پاسکیں گی، جس کی آج وہ سب غلام ہیں۔

وہ دن خاتمۂ جنگ کا اصلی دن ہوگا، اور اقوام عالم کے لیے یوم رحمت و انشراح، شام حسرت کے بعد، یورپ کی بڑی چھوٹی سب قومیں طلوع سحر امید کا جلوہ دیکھیں گی۔

باب پنجم

شامِ حسرت

یورپ کے اکثر ممالک میں انقلابات برپا ہونے والے ہیں۔ یہ وہ خیال ہے، جو آج ہر دماغ میں اور ہر زبان پر ہے۔ اور حکومتیں اگر اس سے ناواقف ہیں تو ان کی نابینائی میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر یہ شے ان کے علم میں نہ بھی ہو تاہم ان کے شعور خفی میں تو ضرور ہے اور اسی لیے وہ ڈر رہی ہیں۔ ان کے اعمال کو غور سے دیکھو تو ان کی خوف و دہشت کا صاف پتہ چل جائے گا،

اور یہ جو لڑائی میں اتنی زیادہ طوالت دی جا رہی ہے، اس کا ایک بہت بڑا محرک یہی اندیشۂ انقلابات ہے۔ حالانکہ جنگ کو جتنی طوالت ہوتی جاتی ہے، اسی قدر انقلابات کا وقوع اور بھی یقینی ہوتا جاتا ہے، اور ہر شے اسی نتیجہ کی طرف لے جا رہی ہے۔

متحاربین کے ذہن میں کوئی مقصد ہو یا نہ ہو، لیکن جنگ بہرحال اپنی ایک غایت لے کر آئی ہے اور یہ وہ مقصد ہے جس کا حصول

متحاربین میں سے کسی کو عزیز نہیں، تاہم وہ غایت پوری ہو کر رہے گی وہ صاف و سادہ غایت یہ ہے کہ فساد کے کہنہ شجر کو بیخ و بن سے برباد ہو جانا چاہیے، معاشرت اقوام کی قدیم بنیادیں منہدم ہو کر ان کے بجائے ایک بہتر و صحیح تر تمدن کی بنیاد پڑنا چاہیے۔ یورپ کی تلوار خود اسی کے اوپر برابر چلتی رہے گی، تا آنکہ ہر قوم کا قلب اس سے چھد جائے اور فساد کا وہ عفریت جو ہر قوم کے قلب کے اندر موجود ہے، ہلاک ہو جائے۔

مختلف اقوام کے درمیان صلح اسی طرح پر ہو سکتی ہے، لیکن یہ صلح یورپ کی اقوام اور حکومتوں کے درمیان نہ ہو گی۔

موجودہ حکومتیں اگرچہ بجائے خود وہ امراض نہیں، جن میں رعایا گرفتار ہے۔ تاہم ان قومی امراض کے لیے وہ منظر اور مادی قالب کا کام ضرور دے رہی ہیں، ان امراض کی تجسیم و تشکیل حکومتیں ہی کرتی ہیں، اقوام کی پوشیدہ آواز ظاہر انھیں حکومتوں کے اعمال سے ہوتی ہے، اور قوم کو جس وقت اپنی حالت کا احساس ہوتا ہے، اور وہ تلافی مافات کرنا چاہتی ہیں، اس وقت وہ ہر اس شے کو جو اس کے دور سابق کی یادگار ہوتی ہے پارہ پارہ کر ڈالتی ہے۔ تحویلِ دین کے وقت وہ جن اصنام، جن معبودانِ سابق کو ریزہ ریزہ کرنے لگتی ہے، وہ اگرچہ ذمہ دار و خطا دار نہیں ہوتے تاہم ان کا پامال ہونا یقینی ہوتا ہے،

حکومتیں اگر اس انتقام کی زد سے محفوظ رہنا چاہتی ہیں، تو اس کی تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ سب سے پہلے وہ خود ہی جدید صورت حال کو قبول کر لیں، اقوام کی تکلیف و اذیت کے صحیح اسباب کا اعتراف کر لیں، اور ان اسباب کا استیصال کر دیں لیکن کیا یورپ کی کوئی حکومت اس اصلاح کو

قبول کرنے کے لیے تیار ہے؟ اور بالفرض کوئی حکومت اس پر آمادہ ہو بھی تو دوسری حکومتوں سے جو سازباز رہتا ہے؟ وہ کب اسے اس پر عمل کرنے دے گا؟

ایسی حالت میں بجز اس کے چارہ نہیں کہ اقوام سررشتۂ عمل خود اپنے ہی ہاتھ میں لے لیں اور وہ یقیناً ایسا کریں گی، جس روز انھیں آج کی خفیہ کارروائیوں کا علم ہو جائے گا۔ اس وقت تک انھیں جس واحد صداقت کا علم ہوا ہے، وہ میدان جنگ میں موت و ہلاکت کی صداقت ہے، اس کے علاوہ اب تک اُن سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ تمام تر مجموعۂ اکاذیب ہے، اکاذیب متعلق بہ اسباب جنگ، اکاذیب متعلق بہ رفتار جنگ، اکاذیب متعلق بہ نتائج جنگ، اکاذیب متعلق بہ ماضی و حال و استقبال، اکاذیب جن کا پردہ ایک روز حق و صداقت کے ہاتھوں فاش ہو کر رہے گا۔

وہ وقت شام حسرت کا ہوگا، وہ وہ شام ہوگی جو موجودہ جنگ کے روز روشن کا خاتمہ کر کے ایک دوسری جنگ برپا کر دے گی یا اس جنگ کو دوسرے قالب میں منتقل کر دے گی اور وہ جنگ یقیناً سب سے آخری جنگ ہوگی، وہ جنگ ان اسباب کے خلاف ہوگی، جو باعث جنگ ہوتے ہیں۔ وہ جنگ ان حالات کے مقابلہ میں ہوگی جو آفرینش جنگ کرتے ہیں، ہلاک شدہ نفوس کے انتقام کا وہ وقت ہوگا۔ وہ شام تمام ان چیزوں کی زندگی کی شام ہوگی، جنھیں جلد سے جلد فنا ہی ہونا چاہیے۔

اگر صرف بدیہی واقعات و حقائق پر نظر رکھی جائے، تو بھی اس کے سوا اور صورت ہو کیا سکتی ہے؟

یورپ کی حکومتو! کیا تم آج جن فریب کاریوں، شعبدہ بازیوں میں

اپنی رعایا کو بتلا کیے ہوئے۔ کل بھی ان پر یہ پردہ پڑا رہے گا؟ کیا جس وقت تمھاری یہ فریب و ریاکاری کی تعمیر کردہ عمارت زمین پر آ رہے گی، اور نتائج کھل جائیں گے اس وقت بھی تم اپنی اپنی رعایا کی آنکھوں میں خاک ڈال سکو گی؟ آج وہ موت سے کھیل رہی ہیں، لیکن کل جب بساط جنگ لٹ جانے کے بعد وہ اپنے اپنے وطن آ کر معیشت میں مصروف ہوں گے، کیا اس وقت بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں گی؟ اور پھر ان کا سامان معیشت کیا ہوگا؟ اور طرز زندگی کیا ہوگا؟

جس وقت ان خانماں بربادوں کے خستہ و مضمحل قویٰ پر ایک ناقابل برداشت بار قرض ڈالا جائے گا، کیا اس وقت بھی تم انھیں دھوکے میں مبتلا رکھو گے؟ کیا ان کے اجسام میں جو کچھ بچا کھچا خون رہ گیا ہے، جب وہ دیکھیں گے کہ شدید ترین ٹیکس اسے بھی پسینہ کی شکل میں نکالے لیتا ہے، اس وقت بھی ان کے کان پر جوں نہ رینگے گی؟ کیا آج جو ان پر ۵۰ ارب پاونڈ (۱ ½ کھرب روپیہ) کا بار ہو چکا ہے، کل بھی تعداد جب مضاعف ہو جائے گی، اس وقت بھی وہ نہ چونکیں گے؟

یورپ کی حکومتو! بتاؤ، آخر تمھارا منشا کیا ہے؟ کیا جس تودہ کے نیچے تم دبی جاتی ہو، یہ چاہتی ہو کہ تمھاری رعایا آ کر اس کا بار سنبھال لے، اور تم بچ جاؤ؟ یا یہ کہ تم اور وہ دونوں اس کے نیچے دفن ہو جائیں؟ تمھاری جو کچھ بھی خواہش ہو، لیکن تمھاری رعایا کے دل میں یہ ہے، کہ جس طرح تم اس کی لاشوں کے ڈھیر کے اوپر کھڑے ہو کر رقصاں ہو، اسی طرح تم سب بھی اسی تودہ کے اندر مدفون ہو جاؤ، اور وہ تمھارے اس ہیبت ناک مدفن کے اوپر کھڑے ہو کر رقص مسرت کرے۔

کیا تم اپنی رعایا سے اس سیل بلا کا اصلی سبب، حقیقی باعث ہمیشہ مخفی رکھ سکتے ہو، جو بجز تمھاری ہوس زر، تمھاری نہ بجھنے والی حرص دولت تمھاری حُب جاہ، تمھاری خود بینی، تمھاری شقاوت اور تمھاری قساوت کے اور کچھ نہیں ؟

انھیں ایک روز یہ علم ہو جانا بالکل قطعی ہے، کہ اصلی زہر جو انھیں اندر اندر ہلاک کر رہا ہے یہی ہے، اور جب زہر کو انھوں نے دریافت کر لیا، تو انھیں اس سے کون قوت باز رکھ سکتی ہے کہ وہ اسے جلد سے جلد اپنے جسم سے نکال تھوکیں ؟

جب ان کی نظروں کے سامنے تمھاری وہ بین الاقوامی سیاسی بساط آجائے گی جس پر تم نے ہمیشہ ان کے جان و مال کو بہ طور مُہروں کے استعمال کیا ہے، جب ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی، کہ جس شے کو حکومت کا لقب دیا گیا ہے، وہ محض ایک وہمی ہستی ہے، جو اپنے اغراض اور اپنی زندگی کے ضمانت نامہ پر ان کے دستخط خون سے کرا لیتی ہے۔ جب ان پر یہ تمام اسرار آشکار ہو جائیں گے کہ طرق حکمرانی ہمیشہ ذاتی اغراض و منافع کے تابع رہے ہیں، شاندار و پرجوش الفاظ سے انھیں جانبازی پر آمادہ کر کے ہمیشہ بعض افراد کے مالی کاروبار میں اضافہ مقصود رہا ہے اور مقتولوں کی کثرت تعداد کے تناسب سے ارباب حل و عقد کی دولت و ثروت جاہ و حشم میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ وہ وقت! آہ جس وقت یہ سارا طلسم باطل ہو جائے گا اس وقت وہی غریب مخلوقات جو اس وقت کتوں کی طرح للکار کر باہم لڑائی جا رہی ہے، الٹ کر تمھارے اوپر جھپٹے گی اور تمھارے جسم کو نوچے گی اور پھاڑے گی۔ قومی خود غرضی و

خود بینی کا وہ ہزار سر عقاب جو انھیں اس وقت ہلاک کر رہا ہے، اس کے خلاف وہ سب مل کر جہاد پر آمادہ ہو جائیں گے، اور جب تک اس کی جان نہ لے لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے،

غریب، ناواقف، بے خبر رعایا، جو ہر فریب کا بہ آسانی شکار ہو جاتی ہے، وہ غلاموں کا گلہ جسے قتل و غارت کے اکھاڑہ کی طرف ہانکا جا رہا ہے، ان میں سے کس کو لڑائی کی خواہش تھی؟ یہ لڑائی میں گئے نہیں بلکہ بیجائے گئے۔ جن پر انھوں نے اعتماد کیا تھا انھوں نے انھیں مناقشت و منافرت کی زہریلی شراب پلا پلا کر مدہوش کر دیا، اور انھیں دانستہ آگ میں جھونک دیا۔

یہ لوگ بغیر سوچے سمجھے جنگ میں شریک ہو گئے، اور اب جو ان کے آقا پچھلے دو سال سے ہزار ہا حیلہ تراشیاں کر کے ان کی فلاکت کو دور کرنے کے مدعی ہو رہے ہیں یہ سب لاحاصل ہے، ان لوگوں نے اب خود ان مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا ہے، کہ آخر جب ہر ملک کی کثیر آبادی اپنے پُرامن مشاغل میں مصروف رہنے کی خواہش مند ہے، تو انھیں کون سر کے بل میدان جنگ میں ڈھکیل دیتا ہے؟ وہ کون حضرات ہیں جو اپنے اخوان و ابنائے جنس کے قتل و ہلاکت کو اپنا مشغلۂ زندگی بنائے ہوئے ہیں؟

اقوام عالم بغیر ان سوالات کے جوابات کو سمجھے ہوئے میدان جنگ سے واپس نہ آئیں گی، اور کسی قوم کے پیش نظر آج یہ سوالات نہیں؟ یہ تو قطعی طور پر ابھی نہیں کہہ سکتے؟ کہ اس زندہ جہنم (جنگ) کے تجربہ کے بعد ان کی نفسیت کیا ہو گئی ہے، تاہم اتنا یقینی ہے کہ واپسی کے بعد یہ لوگ وہ

لوگ نہ ہوں گے جو جنگ میں داخل ہوئے تھے، اب یہ لوگ خواہ ملائک ہو کر واپس آئیں یا شیاطین بن کر، لیکن بہر صورت وہ اس کے دشمن ہو کر آئیں گے جس نے یہ بلا ان کے سر ڈالی تھی، اور اسے پامال کرنے میں تامل نہ کریں گے۔

انہیں آخر ان لوگوں پر رحم کرنے کی وجہ کیا ہے، جو خود رحم ناآشنا ہیں؟ اور جو اگر زندہ بچ گئے تو آئندہ نسل کو پھر اسی طرح کی حالت امن کے بعد اسی طرح مہیب جنگ اور اسی قسم کے جہنم میں ڈھکیلیں گے،

باب ششم

صبح سعادت

یہ ہے جنگ کی حقیقت یہ ہے وہ حقیقت جس پر اس تلاطم و محشر ضطراب میں نظر پڑنی چاہیئے اور جس کا اعلان اس ہنگامہ و غلغلہ حوادث ے باوجود کرنا چاہیئے۔

اس جنگ میں اگر اصلاح مستقبل کی غایت پوشیدہ نہیں، تو ماننا پڑیگا یہ جنگ بے معنی و لاحاصل رہی۔

ظاہر ہے کہ جنگ کا مقصود کسی فریق کی جانب سے سیاسی آزادی کی تحریک یں ہو سکتی، اس لیے ہر فریق کے ہاں مساوی درجہ کی شہنشاہیت و ستبداد کے نظائر موجود ہیں، خواہ ان کا تعلق اندرون ملک سے ہو یا س استعمار سے۔ "زار" (روس) کی مطلق العنانی کس منہ سے "قیصر" (جرمن) ی خود سری پر اعتراض کر سکتی ہے؟ جرمنی کا تشدد و استبداد کس منہ ے انگلستان و فرانس کی ہوسناکیوں پر طعنہ زن ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ظاہر ہے کہ جنگ کی محرک کوئی مذہبی عصبیت نہیں ہو سکتی،

اس لیے کہ پروٹسٹنٹ، کیتھولک دونوں فرقے خود اپنے ہی ہم مشربوں سے جنگ کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی کچھ تعداد ایک فریق کی شریک ہے اور کچھ دوسرے کی، غرض ہر مذہب خود اپنے ہی پیرووں سے دست و گریبان ہو رہا ہے۔

تو کیا نسلی تفریق کچھ اپنا کام کر رہی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ بالکل غیر و اجنبی قومیں تو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک ہیں اور آپس کی اور قرابت دار قومیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی ہیں؟ اور دول متحاربہ کے سلاطین تو (بہ استثناء سلطان ترکی) سب ایک ہی خاندان کے ہیں،

پھر کیا اقتصادی فوائد پیش نظر ہیں؟ یہ کیونکر ممکن ہے، در آنحالیکہ ہر شریک جنگ کی بربادی یقینی ہے، اور ظاہری نفع اگر کسی کا ہے تو ناظر فداروں کا،

ان میں سے کوئی شے بھی نہ سہی، پھر آخر کیا جنگی روح کام کر رہی ہے؟ اگر ایسا ہے، تو اس مہلک محاربہ کا، جس میں آخر وقت تک ہر فریق اپنی کامیابی کا مدعی رہے گا، صرف ایک ہی انجام ہونا ہے یعنی سب کی شکست،

اصلی سبب کے لیے ذرا اور دقت نظر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اس ڈراما کے عقب میں جو اس وقت ہو رہا ہے۔ ایک اور وسیع تر ڈراما ہے، جو رفتہ رفتہ اسٹیج پر نمودار ہو رہا ہے۔ ہجوم مرئیات کے عقب میں یہ جنگ درحقیقت غیر مرئیات کی جنگ ہے۔ یہ وہ جنگ ہے، جو نظام قدیم خود اپنے اوپر کر رہا ہے اور خونریزی و غداری کی طاقتوں کو ایک دوسرے

ے الجھا کر ان سب کو فنا کر رہا ہے۔

یہ منظر بھی قابل دید ہو کہ یورپ کو صدیوں کی عظمت و اقتدار کے بعد ج مظلوم و محکوم قوموں کی خدمت میں اپنے مظالم کا کفارہ کرنا پڑ رہا ہے،

معلوم ایسا ہوتا ہو کہ یہ شعلے یورپ نے اپنے ہاتھوں بھڑکائے ہیں تا کہ ان کے اندر سے گزر کر صفائی و تزکیہ حاصل کرے اور اپنی موت کا خود سامان کیا ہو تا کہ فنا ہو کر قلب ماہیت کے ساتھ حیات تازہ حاصل کرے،

اس یورپ کے ماورا جو اس وقت فنا ہو تا رہا ہے، ایک دوسرا یورپ بھی ہے جو سامان حیات فراہم کر رہا ہے، وہ ایک مبارک و بابرکت ستقبل کے لیے آج اپنی دولت و ثروت نثار کر رہا ہے، اور اپنے تن کی قربانی دے رہا ہے،

اور اگر ایسا نہیں، تو یہ شام حسرت اس شب بلا کا مقدمہ ہی، جس کا ہر مردہ قوم اور ہر بیہودہ تمدن پر طاری ہونا لازمی ہی، ہاں وہ شب تار، جس کی تاریکی موجودہ تاریکی سے کہیں زائد مہیب ہو گی،

اس دور انقلاب و تلاطم نے یورپ کے سامنے دو راستے انتخاب کے لیے پیش کر دیے ہیں، اس کا جی چاہے تو قعر مذلت و پستی، نکبت و ادبار کے تحت الثریٰ کو قبول کرے اور یا گزشتہ زندگی سے تائب ہو کر اصلاح کی راہ اختیار کرے جس شارع عام پر چلنے کا وہ اب تک خوگر تھا اسے دنیا کے زلزلہ عظیم نے بند کر دیا ہے، اب ممکن صورتیں دو ہی ہیں، یا وہ صبح سعادت و عروج کی جانب صعود کرے اور یا شب شقاوت کی انتہائی تاریکیوں اور گہرائیوں میں گرنا قبول کرے!

صبح سعادت کا طلوع! مگر یہ صبح سعادت یوم گزشتہ کی بازگشت نہ ہوگی یہ روشنی وہ ہوگی جس سے دنیا ابھی تک ناآشنا ہے۔ یہ وہ مستقبل ہوگا، جو ماضی سے بالکل مختلف ہوگا، اب تک مستقبل ہمیشہ ماضی کا تتمہ ہی رہا ہے، لیکن اب کی جس وقت تک ظلمت ماضی کا شائبہ باقی رہے گا صبح سعادت کا طلوع نہیں ہو سکتا،

اس ظلمت سے باہر کرنے والی سب سے پہلی کون قومیں ہوں گی؟ ممکن ہے یہ وہی قومیں ہوں جو اس ہنگامہ و فساد کی اصلی باعث ہوئی ہیں یا کم از کم وہ قومیں جو اس عام شکست و تباہی سے سب سے پہلے سبق حاصل کریں گی۔

یہ تباہی و بربادی سب کے لیے عام و مشترک ہوگی، اس کا بار سب کو کچلتا رہے گا، تاآنکہ جو روح اس وقت سب میں کام کر رہی ہے، وہ نادم و تائب ہو۔ موت و ہلاکت کا پنجہ برابر انھیں اپنی گرفت میں رکھے گا تاآنکہ وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی بہتر اصول، اپنے وجود کے لیے کوئی پاکیزہ تر قانون تسلیم کریں،

قوموں کے سامنے جو مسئلہ ہمیشہ رہا ہے وہی اب بھی رہے گا، یعنی آیا وہ اپنی موجودہ حالت پر قائم رہیں گی اور جو کچھ اس وقت گزر رہا ہے وہی گزرتی رہے گی، یا یہ کہ اپنی باطن کی گہرائیوں میں اصلاح قبول کریں گی۔

اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ طرز زندگی میں بعض سطحی تغیرات کر دیے جائیں یا بعض خارجی و اندرونی بیجوہائے کہن میں تبدیلیاں کر دی جائیں، تمام دنیا میں جو تلاطم برپا ہے اس کا مقصود یوں نہیں پورا

ہو سکتا، کہ بعض سیاسی یا انتظامی تغیرات کر دیے جائیں یا آئین ملک یا عہدیداروں کی فہرست میں جزئی ترمیمات کر دی جائیں، قوموں کی قسمتوں کا رخ پھیر دینے کے لیے یہ چیزیں کافی نہیں،

اگر اشیاء میں تغیر نہ ہوا، تو محض اشخاص کے تبادلہ سے کیا نتیجہ؟ اسی طرح اگر اشخاص اپنی اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے تو اشیاء میں تغیر و ترمیم کر دینے سے کیا حاصل ہے؟ اشیاء و اشخاص دونوں کی روح میں تغیر پیدا کرنے کی اصل ضرورت ہے، ہر قوم کی روح کی قلب ماہئیت اور سب کے قلوب میں ایک جدید نظام کائنات کا احساس پیدا ہونا لازمی ہے

ہر قوم میں کچھ نفوس ایسے ہیں جو عام اژدہام میں گم ہیں، جن میں اس کائنات جدید کا احساس ہے، ان کا تعلق گزشتہ صدی سے نہیں، وہ گویا مستقبل کی پیداوار ہیں۔

یہ نفوس تعداد میں بہت ہی قلیل ہیں لیکن بہت سے ایسے ہیں جو دور سے اُن کی پیروی کر رہے ہیں اور روز بروز ان کے قریب آتے جاتے ہیں، بہت سے افراد ایسے ہیں، جن کی خود فریبیوں کا طلسم باطل ہو چکا ہے اور جن کے دلوں سے نفرت و بغض کے نقوش رخصت ہو رہے ہیں وہ اپنے اندر ایک غیر متوقع صبح سعادت کی ہلکی شعاعوں کا نور پا رہے ہیں، امتداد زمانہ کے ساتھ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، یہاں تک کہ کل ہر قوم عبارت انھیں افراد کی جماعت سے ہو گی۔

اس قسم کے افراد کو باہم متحد ہو جانا چاہیے، ایسے افراد ہر قوم میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی روحانی مادر وطن کے فرزند ہیں، ان سب کو اس

مقصود کے لیے متحد ہونا چاہیے کہ اعضائے شکستۂ یورپ کو عمیق غار سے باہر نکالیں انھیں اس غرض کے لیے متحد ہونا چاہیے کہ یورپ گزشتہ کے ڈھیر سے یورپ آیندہ کی تعمیر کریں اور اگر یورپ جدید کو ابھی ان کی صدا پر لبیک کہنے میں تامل ہو رہا ہے، تو انھیں چاہیے کہ اپنے پیغام اعظم کی تبلیغ ان ممالک میں کریں جہاں اب بھی خلوص کا وجود باقی ہے، آفتاب صبح سعادت کے آگے ڈنڈوت مشرق ہی میں کرتے رہنا چاہیے، تاآنکہ اس کی شعاعیں مغرب کو منور کر دیں۔

ہر قوم میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں، جن کا تعلق کسی ایک مخصوص قوم سے نہیں ہوتا۔ وہ نوع انسانی کے خدمت گزار ہوتے ہیں، وطنیت کے فرض سے بڑھ کر وہ انسانیت کے فرض کو تسلیم کرتے ہیں، نوع انسانی اس وقت اپنی محنت کے صلہ کے لیے اور اپنی مظلومیت کی داد رسی کے لیے انھیں اشخاص کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے ہے۔

کہاں ہیں یہ افراد، اب انھیں اور دنیا کے سامنے قانون عدل کی منادی کریں، جس طرح یہ قانون خاندانوں کے درمیان عامل سمجھا جاتا ہے، اسی طرح آیندہ اس قانون کو اقوام کے باہمی تعلقات پر بھی حاکم رہنا چاہیے یہ قانون جس طرح ایک قوم کے مختلف افراد کے درمیان امن و آشتی قائم رکھتا ہے اسی طرح دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان عامل ہونا چاہیے، ان سب کو متحد ہو کر ایک صلح انسانی مرتب کرنا چاہیے یہ آگے بڑھیں اور ماضی کے عہد اور مستقبل کی تمنا کو پورا کر دکھائیں اس وقت تمام اُمم سابقہ و آیندہ، تمام اگلی اور پچھلی نسلوں کی نظریں اسی موجودہ نسل پر پڑ رہی ہیں۔ صدیوں کی آرزوے دیرینہ کا پورا کرنا اسی موجودہ نسل کے ہاتھ میں ہے اور اسی عظیم الشان تلاطم کے بعد جس کی نظیر تاریخ کائنات میں نہیں ملتی، وہ "آرزوے دیرینہ" کیا ہے؟ وہ آرزو اس صبح سعادت کے طلوع کی آرزو ہے۔ جس کی روشنی اب تک کبھی عالم انسانی پر نہیں پڑی ہے۔

حصّہ دوم

باب (۱)

قانونِ اقوام

خوشی سے ہو یا ناخوشی سے بہر حال صورت واقعہ یہ ہے کہ تمام قومیں روئے زمین پر مل جل کر آباد ہیں، اور ہر قوم مجموعۂ انسانیت کی ایک فرد ہے جو اپنی ایک مستقل شخصیت اور جداگانہ ہستی رکھتی ہے۔

بدقسمتی سے ان اجتماعی ہستیوں کے نفس نے ابھی حیات و شعور حیوانی سے آگے ترقی نہیں کی ہے، ان کی باہمی معاشرت اب تک ایک جماعت کی صورت پیش کر رہی ہے، مگر کس کی جماعت؟ افرادِ انسانی کی نہیں، بلکہ وحشی جانوروں کی ان میں جو سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں ان کی حیثیت شکاری جانوروں سے زائد نہیں، یہ حقیقت اپنے اندر ایک خاص معنی رکھتی ہے، کہ ان قوموں نے جو اپنے اپنے نشانات اور پھریرے مقرر کیے ہیں، وہ خونخوار حیوانات ہی کے ہیں[۱] مثلاً شیر، عقاب، ریچھ، تیندوا یا ایسے جانور جو قوت میں کم سہی، تاہم جنگ جوئی میں کمتر نہیں، مثلاً مرغ،

---

[۱] برطانیہ کے جھنڈے پر شیر کی تصویر ہے، جرمن کے جھنڈے پر عقاب، روس کے علم پر ریچھ کی۔ م

اس وقت تک جو قانون، اقوام کے باہمی تعلقات پر عامل رہا ہے، وہ درندوں کا قانون ہے یعنی طاقت کا قانون، یا جنگ کا قانون۔

وقت آگیا ہے کہ اب یہ اجتماعی ہستیاں حیوانیت کی سطح سے گزر کر انسانیت کے مرتبہ پر آئیں اور انسانی اخلاق پر عمل کریں۔

افراد اور اقوام کے لیے قانون اخلاق ایک ہی ہے۔ ہر قوم کو اپنے تئیں اسی نظام اخلاق کا پابند رکھنا چاہیے، جس کی پابندی کی توقع وہ افراد سے رکھتی ہے جو شے فرد کے لیے جرم کا حکم رکھتی ہے، وہ ملک وقوم کے لیے بھی جرم قرار پانا چاہیے، خود غرضی، حرص وطمع غصب اموال، تشدد، اور قتل، اگر افراد کے لیے شدید ترین معاصی ہیں تو جماعت وقوم کے لیے بھی ان افعال کو مساوی درجہ کے معاصی قرار دینا چاہیے، آخر قومی شرافت کا معیار شخصی شرافت سے مختلف کیوں ہو؟ اور اگر کوئی قوم قتل وغارت، بدعہدی وتشدد سے علانیہ اپنی بے عزتی وپستی کا ثبوت دے چکتی ہے، تو کیا اسلحہ کی مدد سے وہ عزت وبلندی قائم رکھ سکتی ہے؟ جس طرح فرد کی عزت کا اصلی معیار یہ ہے کہ وہ اپنی طاقت کو کیونکر اور کن مواقع پر استعمال کرتی ہے؟ عزت دولت پر مبنی نہیں بلکہ اسکا صحیح معیار یہ ہے کہ دولت کا حصول وصرف کیونکر ہوتا ہے، عزت کے معنی یہ نہیں کہ دوسرے ہمارے محکوم ہوں، بلکہ یہ کہ خود ہمارا نفس ہمارا محکوم ہو عزت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان میں عظمت نفس اور دوسروں کی تعظیم وتکریم ہو۔

باعزت افراد، ہر قوم میں موجود رہتے ہیں، با این ہمہ ہر قوم اپنی بے عزتی وذلت اپنے ہاتھوں کرتی رہتی ہے، آخر کس دن قوموں کو اس کا احساس

ہوگا کہ جو چیزیں انھیں ذلیل و پست کرنے والی ہیں۔ ان پر وہ فخر کر رہی ہیں'

فرد کے لیے اخلاق نے قانون یہ مقرر کیا تھا کہ اسے وہ عمل کرتے رہنا چاہیے جس کی نظیر کو سب قبول کر سکیں، یہی ضابطہ اخلاق قوم کے لیے بھی ہونا چاہیے گویا قوم کو ایسے ہی اعمال کرتے رہنا چاہیے جو افراد کے لیے قابل قبول ہوں۔

اگر اس اصول کی صحت سے انکار ہی تو کس حق سے ہر قوم اپنے ہاں کے مجرموں کو قابل تعزیر قرار دیتی ہی، اور کسی کو مجرم ہی قرار دینے کا اسے کیا حق ہے؟ کیونکہ یہ نام نہاد "جرائم" تو وہی ہوتے ہیں، جن کا ارتکاب قوم علانیہ کرتی رہتی ہے، حُب جاہ، خود غرضی، ریاکاری، غصب اموال وغیرہ ہر قوم جو ارتکاب جرائم کرتی رہتی ہے، اس کی مستحق ہوتی ہے کہ اسی تناسب سے اس کے ہاں جرائم پیشہ افراد کی تعداد ہو،

دنیا میں اس کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے، کہ کوئی باشندہ ملک اپنے ملک سے زیادہ دیانتدار ہو! پھر آخر یہ کیا ہے، کہ افراد ان جرائم کی سزا بخوشی قبول کر لیتے ہیں، جن کا ارتکاب ان کا ملک و وطن علانیہ و فخریہ کرتا رہتا ہو! اور ملک و وطن کو کیوں کہا جائے زیادہ صحیح طور پر یہ کہنا چاہیے کہ جن افعال کا ارتکاب طبقہ حکمران، وطنیت و فوائد قومی کا نام لے کر برابر کرتا رہتا ہو، انھیں رعایا اپنے لیے جرائم کس بنا پر قبول کرتی ہے؟

تقلید و اتباع کے لیے خود سلطنت کو اپنا اسوۂ حسنہ پیش کرنا چاہیے، اگر زور و طاقت آزمائی کرنا اور غیر مسلح پر ہتھیار اٹھانا ایک فرد کے لیے ننگ و ننگی ہے تو یہی فتوی اقوام کی ان حرکتوں پر کیوں نہ صادر ہونا چاہیے۔

اگر اپنے ہمسایہ پر جاسوس بنے رہنا، اپنے میزبان سے بدعہدی کرنا اور اپنی بات کا ذرا پاس نہ کرنا، افراد کے لیے کم ظرفی و ذلت کا موجب ہے تو اقوام کو ان حرکتوں کے بعد ان القاب سے کیوں مستثنیٰ رہنا چاہیئے؟

اگر تخویف یا خداعی سے نفع حاصل کرنا، یا کسی کا مال غصب کر لینا، افراد کے لیے ناجائز ہے تو اقوام کے لیے ان حرکتوں کا جواز کہاں سے ثابت ہو جائے گا؟

ہر فرد پر بشرطیکہ وہ اپنے ملک و وطن کا درد رکھتا ہے، واجب ہے کہ اس طرح کے اعمال و افعال سے اپنا دامن ہمیشہ الگ رکھے اور ان کے ارتکاب یا اعانت کسی شے میں کسی طرح نہ شریک ہو، خواہ اس کے سامنے منصب سفارت ہی کی رشوت کیوں نہ پیش کی جائے۔

وطنیت یا وطن پرستی کا نام آج ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے، لیکن وطنیت کو معزز و بلند کرنا چاہیے، اس کے مرتبہ میں دناءت و پستی نہیں، بلکہ شرافت و بلندی پیدا کرنا چاہیے، ورنہ اس وقت تو عموماً وہ ایک پست و ذلیل شے ہے۔

ہر فرد کو مادر وطن سے محبت کرنا چاہیے، لیکن کون شخص اسے پسند کرے گا، کہ اس کی ماں ظالم و شقی القلب یا دروغ گو و سارق ہو؟

برایں ہم آج ہر ملک میں ایسے مدعیان حب وطن موجود ہیں جو اپنے ملک کی کامیابی و عظمت کا سب سے زیادہ احساس اس وقت کرتے ہیں، جب ان کی مادر وطن دوسروں کے مقبوضات و علاقہ جات پر غاصبانہ قبضہ کر لیتی ہو یا کمزوروں کو قتل و غارت کر چکی ہوتی ہو، اور پھر ان آبادیوں کو جن گے

س کافی قوت اسلحہ موجود نہیں اپنے حلقہ غلامی میں لے آ چکی ہے ان "محبان طن" ارباب حل وعقد قوم کے چہرے اس وقت فخر و مسرت سے چمکتے ہوتے یں، جبکہ ان کی مادر وطن ان جرائم کا ارتکاب کر چکی ہوتی ہے، جو اگر خود ن کی اولاد سے سرزد ہوئے ہوتے، تو مارے شرم و غیرت کے وہ کسی کو منھ ھانے کے قابل نہ رہتے!

سچی محبت وطن کا یہ ہرگز مفہوم نہیں سچی وطن دوستی ہرگز یہ نہیں، کہ کاری کتوں کی طرح برابر اہل وطن کو دوسروں پر حملہ آور ہونے کے لیے کارا جاتا رہے، اور نہ یہ ہے کہ جب وہ نیا شکار منھ میں دابے ہوئے پس آئیں تو ان کی پشت پر تھپکیاں دی جائیں۔

حقیقی محبان وطن کی شناخت یہ ہے کہ جن افعال سے دوسروں کے جذبہ ر و غرور کو تحریک ہوتی ہے، ان پر ان کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ ان کی یان یہ ہے کہ ان کا ملک جب کوئی ناجائز نفع حاصل کرتا ہے، تو ان کے نسو نکل آتے ہیں، ان افعال سے ان کی نظر میں وہ برتر نہیں بلکہ مفلس تر ست ہوتا ہے، جو حقیقی حسن و ثروت سے معریٰ اور محض افلاس اخلاقی چیتھڑوں سے ملبوس ہے،

یہ سچے محبان وطن کہاں ہیں؟ انھیں اپنے مادر وطن کے تھ اس درجہ محبت ہونا چاہیے کہ یہ اس میں کسی قسم کی خامی یا لغزش رداشت نہ کر سکیں۔ اس کی پستی و ذلت کی کوئی بات ہی برداشت نہ کر سکیں میدان جنگ کے گرد و غبار کے ساتھ اس کے چہرہ پر خون کی چھینٹیں پڑنا کسی حالت میں بھی نہ قبول کریں،

یہ اصول بالکل بدیہی و ابتدائی ہیں، ان موٹے موٹے ضوابط اخلاق

بہ غامض مسائل کی طرح غور و خوض کرنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ہم ابھی دورِ توحش میں ہیں تاہم اصلاح کا آغاز بالکل ابتدا سے کرنا چاہیے اور ترقی کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہیے، اس شاہراہ پر پہلا قدم آج ہی پڑنا چاہیے۔

جو تعلق فرد کو خاندان سے ہوتا ہے، خاندان کو شہر سے، شہر کو صوبہ سے اور صوبہ کو ملک سے، وہی تعلق اب ملک کو مجموعۂ ممالک (دُنیا) سے ہونا چاہیے ملک کو صرف اپنی ہی زندگی کی نہیں بلکہ اس سے زائد کی بھی پروا ہونا چاہیے افراد و اقوام دونوں کے لیے یہی اخلاق کا صحیح قانون ہے، اور یہی فلاح و نجات کا سیدھا راستہ ہے،

یورپ کو تو سبق مل چکا ہے، لیکن آئندہ سے ہر قوم کو یہی سبق حاصل کرنا چاہیے کہ نجات کے اس راستہ کے علاوہ باقی جتنی راہیں ہیں، وہ سب بربادی و ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔

باب (۲)

فریضۂ اقوام

فرد و قوم کی عظمت ہمیشہ اس نصب العین کی عظمت کے متناسب ہوتی ہی، جو اس کے پیش نظر ہوتا ہی، بشرطیکہ اس کے مطابق عمل در آمد بھی ہوتا رہو، یہ شرط اس لیے ضروری ہی کہ نصب العین عموماً محض ایک زبانی دعوے کا نام ہوتا ہے اور عمل در آمد اس کے برعکس ہی ہوتا ہے۔

اس دنیا کا جو اس وقت فنا ہو رہی ہی، نصب العین کیا تھا؟ جہاں تک زبانی دعوؤں کا تعلق ہے اس سے زیادہ شریفانہ اصول سے دنیا کی تاریخ ناواقف ہی "حریت" "عدل" "سائنس" "ترقی" "تمدن" یہ الفاظ ساری فضا میں گونج رہے تھے لیکن اگر عمل پر نظر کیجئے تو اب سے پست تر قعر انحطاط میں بھی دنیا کبھی نہ تھی، ان قوموں نے جو اپنی عظمت کی مدعی ہیں "حریت" سے متعلق اپنا عمل کیا رکھا؟ یہ کہ اسے صرف اپنے لیے مخصوص و محدود کر لیا، اور جن قوموں کی زبانوں پر سب سے زیادہ ترانۂ حریت رہتا ہے وہی عملاً دوسروں کی حریت سلب کرنے میں سب سے پیش پیش رہتی ہیں، ان کی اصطلاح عمل میں گویا آزادی کے معنی یہ ہیں کہ انھیں

ساری دنیا کو اپنی غلامی میں لانے کی "آزادی" حاصل رہی۔

"عدل" کا دعویٰ انھوں نے کیونکر نباہا؟ یوں کہ اپنے مقاصد و اغراض کو ہر طرح پر محفوظ کر لیا، اور دوسروں کے حقوق کے جواز و عدم جواز کا معیار محض مدارج قوت کو قرار دیا۔

"سائنس" سے انھوں نے کیا کام لیا؟ یہ کہ اسے اپنی ہوسناکیوں کا آلہ بنایا اور تاریخ میں اپنے متعلق یہ فقرہ ثبت کرا دیا، کہ انھوں نے بہت کچھ علم حاصل کیا، لیکن اسے بُرائی ہی میں صرف کیا۔

"ترقی" کے انھوں نے کیا معنی لیئے؟ ایک قالب بے روح اور ان کی خود غرضیوں و جذبۂ حُب جاہ کی تسکین کا ایک مادی آلہ،

"تمدن" سے انھوں نے کیا مراد لی؟ دھوکے کی ٹٹی، فریب و ریا کاری کا ایک جال اور ان کے اسلحۂ آتشیں کے استعمال کے لیے ایک سندِ جواز،

"انسانیت" کا انھوں نے کیا مفہوم قرار دیا؟ جلب منفعت کی منڈی، سود خواری کا کاروبار، کمزور و ناتواں قومیں بھی گویا جائداد منقولہ تھیں، کہ جب جی چاہا بہ آسانی ان کا بیع و شری کر دیا، یا مویشی تھے کہ اپنی غذا کی ضروریات کے لیے ان کی پرورش کرتے رہے۔

انھیں بداعمالیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان مقدس الفاظ کا نور، قتل و خون کے سُرخ شعلوں میں تبدیل ہو گیا۔

اب تک قوموں کا نصب العین حصولِ اقتدار رہا ہے۔ مگر یہ نصب العین ہمیشہ پست رہا، اس لیے کہ اس اقتدار سے محض مادی اقتدار مقصود تھا۔ جو شے شمار و حساب میں نہ آ سکتی وہ کسی شمار و قطار میں نہ تھی۔

یہ لوگ اس تمنا میں رہے کہ قوت وثروت کے ذریعہ سے عظمت واقتدار حاصل کریں، ہاں وہ قوت جو روپیہ کے زور سے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ روپیہ جو قوت کی مدد سے حاصل ہو، انھوں نے اپنے مقبوضات کی وسعت وکثرت کی بنا پر بڑائی حاصل کرنا چاہی، اس خیال سے کہ مقبوضات کی تعداد، قوت وثروت دونوں پیدا کرتی ہی، یہی سمجھ کر انھوں نے اپنے مقاصد اپنے اغراض پر ہر شے کو قربان کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ بالآخر اپنی جانوں کو بھی قربان کر دیا۔

"تسخیر ممالک وحکمرانی اقوام" ان دو لفظوں میں ان کے سارے پروگرام کا خلاصہ تھا، اور اس کے مطابق انھوں نے پورا عمل کیا، یہاں تک کہ پورے کرۂ ارض کو انھوں نے باہم تقسیم کر لیا، اس کے بعد پھر کیا شے باقی رہ سکتی تھی؟ ہاں ایک شے تھی یعنی حصہ داروں کی تعداد کم کر دی جائے، اور ہر حصہ دار دوسرے کا حصہ خود ہی لیکر پیشتر کے مقابلہ میں بہت بڑا ہو جائے، چنانچہ اس وقت یہی ہو رہا ہے۔

جس وقت تک دنیا میں ایسی قوموں کا وجود باقی ہے، جن میں حدود مادی کی توسیع کی اسی قدر ہوس وآرزو ہے، وہ ایسا کرتی رہیں گی، یہاں تک کہ اگر سب مٹ مٹا کر کل دو ہی قومیں باقی رہ جائیں، تو ان کے بھی ایک دوسرے کو فنا کر دینے کی کوشش، اسی طرح جاری رہے گی۔

مگر کیا یہ حال کا تجربہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے؟ کیا یہ سبق ہمیشہ دہرایا جاتا رہے گا؟ دنیا میں اب تک کتنی متمول، پُر قوت، وفاتح سلطنتیں گزر چکی ہیں، جن کے مٹے ہوئے آثار پر موجودہ قوموں نے بھی گرم خرامی کی کوشش کی، کیا اب ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ حبِ جاہ وطمع زر کا یہ اندھا جوش انھیں کہاں لیے جا رہا ہے۔

یہ دنیا جو اس وقت فنا ہو رہی ہے، اس نے اقلیم مادہ کی تسخیر کی، یہاں تک

کچھ مضائقہ نہ تھا، اقلیم مادہ کو بھی انسان کے تصرف میں رہنا چاہیے، لیکن چونکہ اس دنیا نے اپنا منتہائے نظر اسی عالم مادیات کو بنا لیا اور اس خاکدان مادی کے دائرہ سے قدم بڑھانا گناہ سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اسی کی ٹکر نے اسے چکنا چور کر دیا، فطرت کا مقصد یہ تھا کہ قومیں اپنا قدم آگے بڑھائیں اور بلند تر مرتبہ پر پہنچیں، چنانچہ اب بھی جو قومیں فطرت کے اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہوں گی، انھیں کے بچنے کی امید ہو سکتی ہے

عظمت کا صحیح معیار رقبہ کی وسعت نہیں، حقیقی عظمت مادی پیمائش و مساحت کی شے نہیں۔ نشو و نما بے شک قوموں کا نصب العین ہونا چاہیے، لیکن یہ نمو بلندی میں ہونا چاہیے، نہ کہ طول و عرض میں۔ بالیدگی اس خطۂ زمین میں نہیں جو کسی قوم کے زیر نگیں ہوتا ہے، بلکہ ان افراد میں ہونا چاہیے، جن سے قوم مرکب ہوتی ہے، اضافہ ان افراد کی تعداد میں نہیں، بلکہ ان کی قیمت، ان کی وقعت ان کی حیثیت میں ہونا چاہیے، سب سے بڑا ملک وہ ہے جس کے حدود خواہ وسیع ہوں یا مختصر، مگر جس میں انسانیت حد کمال کو پہنچی ہوتی ہے۔

کون شخص ایسا ہے، جو اپنی سکونت کے لیے ایک نہایت مختصر مگر شریف الاخلاق و پُر سکون ملک کو ہماری موجودہ وسیع و عظیم الشان اور نو آبادیاں رکھنے والی سلطنتوں پر نہ ترجیح دیگا؟ کون شخص ایسا ہے جو فلاطوں کے ایتھنز (اثینہ)[1] کو عہد کلیگولا[2] کے روم پر

---

[1] فلاطون کے زمانہ تک یونانی حکومت، چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل تھی جن کا رقبہ ایک ایک شہر کا ہوتا تھا، ان میں سب سے زیادہ مشہور ایتھنز کی ریاست ہے یہ وہی شہر ہے، جو آج یونانی سلطنت کا پایہ تخت ہے۔ م

[2] کلیگولا روم کا حریص و بیہیت و سفاک تاجدار، اس کے زمانہ میں رومی شہنشاہیت کا طنطنہ تمام عالم میں مسلّم تھا۔

ترجیح نہ دے گا،

لیکن قوموں کا مطمح نظر جس طرح رقبہ ووسعت حدود نہ ہونا چاہیے اسی طرح مال ودولت بھی نہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ ترقی وکمال کا حقیقی معیار زر ومال نہیں قوم کی اصلی دولت وہ سونا نہیں جو چمکتا ہے، بلکہ اس کے افراد کی وہ خوش دماغی ہے جو سارے عالم کو منور کرتی ہے۔ قومی تمول کا معیار یہ ہے کہ وہ دنیا کے سرمایہ میں کس حد تک اضافہ کرتا ہے، قوم متمول اس وقت ہوتی ہے، جب وہ ترقی کا کوئی جدید راز معاشرت کا کوئی بلند اصول دریافت کرتی ہے، کسی قوم کے متمول ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس کے پاس ان چیزوں کا کافی ذخیرہ ہو جو دنیا میں پیشتر سے موجود تھیں بلکہ یہ مفہوم ہے کہ وہ ان جدید چیزوں کی تخلیق کرے، جو اس وقت تک دنیا میں نہ تھیں، نسل انسانی کے فوائد ومنافع میں اضافہ کرے، اور انسانیت کے احساس کو ترقی دے۔

علی ہذا اقتدار بھی قوم کا مطمح نظر نہ ہونا چاہیے، اصلی اقتدار وہ ہے جو انسان کی مسرت وراحت میں اضافہ کرے، مادی قوت کی نمائش، اقتدار کا صحیح معیار نہیں، حقیقی تسخیر، پائدار تسخیر، نفس وروح کی تسخیر ہے، حقیقی قوت روشنی کی قوت ہے، قوم کی حقیقی شان وشوکت کا معیار یہ ہے کہ وہ دنیا میں روشنی پھیلانے میں کس حد تک معین ہوئی ہے،

قوت، ثروت، وسعت رقبہ بے شک مفید وقابل قدر چیزیں ہیں، مگر اسی وقت تک کہ جب تک فریضۂ انسانیت کی ماتحتی میں ان سے کام لیا جائے، اور مختلف اقوام کا باہمی رشک ورقابت صرف اسی حالت میں کارآمد ہو سکتا ہے جب اس فریضہ انسانیت کی تکمیل کے لیے باہم مسابقت ہو،

قوموں کا مطمح نظر، خود غرضی کی ضد بے غرضی ہونا چاہیے کہ یہی بے غرضانہ

مطمحِ نظر حقیقتہً مقاصد و اغراض کے حق میں سب سے زیادہ مفید ہوگا۔

مطمحِ نظر کے معنیٰ یہ ہیں کہ مستقبل اسے پورا کرانا چاہتا ہے، آج کا مطمحِ نظر کل ایک حاصل شدہ شئے بن جاتا ہے، اس بنا پر جو قوم اپنے مطمحِ نظر کے پورا کرنے پر جتنا زیادہ توجہ ہوتی ہے اسی قدر وہ گویا مستقبل سے زیادہ اتحاد پیدا کرتی جاتی ہے اور خود اپنے مستقبل کو مستحکم بناتی جاتی ہے، وہ جس قدر ان چیزوں پر عمل کرتی جاتی ہے، جن کا نام حریت عدل و ترقی رکھا گیا ہے۔ اسی قدر اپنا مقصد وجود پورا کرتی جاتی ہے، اسی طرح جو قوم ان چیزوں کو بھلا دیتی ہے، ان حقایق کو بھلا دیتی ہے، ان حقائق کو پس پشت ڈال دیتی ہے، اور محض خود غرضی و نفس پرستی کو اپنا مقصود حیات سمجھنے لگتی ہے وہ روز بروز مستقبل سے دور ہوتی جاتی ہے، بلکہ اس سے متصادم ہو جاتی ہے، اس تصادم کا نتیجہ صرف ایک ہی ہوتا ہے، یعنی بڑی زبردست قوم کو بھی بالآخر شکست و موت ہی نصیب ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ دنیا میں کتنی شہنشاہیاں قائم ہوئیں، مگر اسی خود غرضی کی روش نے ایک ایک کر کے سب کو ملیا میٹ کر دیا، کیا موجودہ خود غرض شہنشاہیوں میں سے کسی کے بچنے کی توقع ہے؟

کسی قوم کے وجود کی غایت خود ہی وخود پروری نہیں ہو سکتی، ہر قوم کی زندگی کا سہارا وہ خدمات ہوتے ہیں، جو وہ عالم انسانیت کے لیے کرتی رہتی ہے۔ اس کی زندگی کی مدت اسی وقت تک رہتی ہے، جب تک کہ اس کے ذریعہ سے خدمتِ خلق ہو رہی ہے، اس درمیان اگر وہ خود غرضی ہی کو اپنا مقصود حیات بنائے رکھے لیکن بالواسطہ و اضطراراً بھی اگر اس سے دنیا کو فائدہ پہنچا رہتا ہو، تو بھی اس کی زندگی قائم رہ سکتی ہے۔ لیکن جوں ہی اس کی حیثیت افادی ختم ہو جاتی ہے وہ قوت جو اس کا سرمایہ زیست تھی، اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تاآنکہ وہ قوم زوال و انحطاط کی پستیاں طے کرتے کرتے موت و ہلاکت کے غار میں گر کر نابید ہو جاتی ہے۔

اس لیے کہ اب انسانیت کو اس کے وجود کی ضرورت باقی نہیں رہتی

کل قوموں کو ان قوانین کا علم ہو جائے گا جن کا درس آج مصائب و نوازل انھیں دے رہے ہیں، اس کے بعد سے کسی قوم کو ان کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو سکے گی، لیکن وہ خوش قسمت قوم کون ہے، جس کے نصیب میں اس سبق کو سب سے پہلے حاصل کرنے اور اس کے مطابق عمل درآمد کرنے کی توفیق ہے؟ وہ خوش نصیب قوم کون ہے، جو اس دولت و اقبال لازوال کو حاصل کر کے دنیا کے سامنے سب سے پہلے اپنا اسوۂ حسنہ پیش کرے گی، اور خدمت انسانیت کو منتہائے مقصود، بے غرضی کو اپنا قانون عمل، فرض کو اپنا محافظ اور مستقبل کو اپنا معین و یاور بنالے گی؟

——— ❊ ———

باب (۳)

ترقیٔ اقوام

اس وقت کرۂ ارض جن سو ممالک میں تقسیم ہے، وہ درحقیقت اقلیم عالم کے سو صوبے ہیں، اور ان میں جو سو قومیں آباد ہیں، وہ نسل انسانی کے سو خاندان ہیں لیکن کسی کا خیال اس حقیقی رشتہ کی طرف نہیں جاتا بلکہ ہر ایک محض اپنی ہی خیر مناتا ہے۔

ان میں سے اکثر ایک دوسرے کے وجود ہی کو بھلائے ہوئے ہیں اور مل جل کر رہنے کا انھیں خیال ہی نہیں آتا، اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر قوم اپنے دائرہ توجہ کو محض اپنی ذاتی زندگی تک محدود رکھتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ اپنی زندگی پورے سکون و بے فکری کے ساتھ بسر کرے جو چیزیں ان کی ان تن آسانیوں میں معین ہوتی ہیں۔ انھیں یہ ترقی سے موسوم کرتی ہیں۔

مگر چند قومیں اور بھی ہیں جن کا دائرہ دلچسپی اس قدر محدود نہیں اور نہ ان کی انانیت اس قدر ساکن و جامد ہے، انھیں تمام دنیا سے دلچسپی ہے، اس لیے کہ ان کے اغراض و مقاصد سب کہیں پھیلے ہوئے ہیں، دنیا میں کہیں

کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جس میں ان کا ہاتھ نہ شریک ہو، اور جس کے نفع کے وہ حصہ دار نہ ہوں۔ ان قوموں کی تعداد زائد نہیں ایک درجن سے بھی کم ہی ہے، لیکن ان کا جال ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اور چونکہ یہ سب کی سب ہر چیز میں حصہ لگانا چاہتی ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے مختلف و مشترک اغراض کو پیش نظر رکھ کر اپنے تئیں دو یا تین انجمنوں یا جتھوں میں تقسیم کر لیا ہے، جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں، گویا یہ قومیں معاشرت پسند ہیں، لیکن ان کی معاشرت آپس کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں تک محدود ہے، جو چیزیں ان کے اغراض حرص و ہوس میں معین ہوتی ہیں، ان کا نام ان کی اصطلاح میں ترقی ہے،

دنیا کی خوش قسمتی سے اب تک یہ ٹکڑیاں باہم دگر حریف و رقیب رہی ہیں، دنیا کی عادل و فہمیدہ حکمراں اقوام کا باہمی اتحاد بے شک ایک مبارک چیز ہے، لیکن اسی طرح مستبد اقوام کا اتحاد جن کے درمیان محض حرص و ہوس مشترک ہو، امن عالم کے حق میں خطرہ سے خالی نہ تھا اور اگر جس بنا پر بعض سلطنتیں اس عام اتحاد سے الگ رہی ہیں، وہ شے سب میں مشترک ہوتی تو اب تک "دول متحدہ یورپ" کا نظام تمام دنیا کو آپس میں تقسیم کر لینے کی غرض سے قائم ہو چکا ہوتا۔ اس عالمگیر جنگ نے اس خواب کی تعبیر کو ایک عرصہ کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔

فرد اگر جماعت سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے تو مجرم سمجھا جاتا ہے لیکن اقوام اب تک باہمی معاشرت سے نا آشنا ہیں، ایک دوسرے سے یہ کب ملتی ہیں؟ یا غلام بنانے کے لیے یا غصب حقوق میں باہمی شرکت کے لیے، ان کی حکومت کے معنی یہ ہیں، کہ اس کے سوا یہ اور کسی شے کے قابل نہیں، ان کے لیے واجب التسلیم

صرف ان کی "مقدس" انانیت ہی، جو دوسروں کو ہلاک و برباد کرتے کرتے آخر خود اپنی بربادی و ہلاکت کا سبب بن جاتی ہی۔

انانیت ہی وہ مخفی محرک ہی، جو سب کو ایک دوسرے سے لڑاتی رہتی ہی، خود غرضی کا آخری نتیجہ ہمیشہ بہیانہ جنگ و جدل ہوتا ہی، امن و صلح کی لاکھ کوشش کی جائے، لیکن خود غرضی کبھی بغیر مقاتلہ و خونریزی تک پہنچائے رہ نہیں سکتی، اس کے مقابلہ میں ہر طرح کے "اتحاد" و "ائتلاف" بے کار ہیں، بجز اس کے کہ ان کی وجہ سے یہ شعلے عالمگیر ہو جاتے ہیں،

ان اقوام کی اصطلاح میں "بربریت" کا مفہوم صرف یہ ہی کہ اسلحہ حرب جدید ترین نمونوں کے مطابق نہ ہوں۔ اور "متمدن" سلطنتوں کی اصلی شناخت یہ ہی کہ باہم "التوائے جنگ" رہی، لیکن کمزور قوموں پر فوج کشی جاری رہے، اور سب سے بڑھکر یہ کہ فرصت مہلک سے مہلک تر آلات حرب کی ایجاد اور آیندہ جنگ کی تیاریوں میں صرف ہوتی رہی،

سائنٹفک اشخاص کا ایک گروہ تو انھیں آلات حرب کی ایجاد و اختراع میں مشغول رہتا ہی، لیکن ایک اور گروہ جو اس سے بھی زائد سائنٹفک ہی اس کا مشغلہ یہ ہی کہ اس مسئلہ کو بہ دلائل و براہین ثابت کرتا رہی کہ انتخاب طبیعی و بقائے اصلح کے وہ قوانین جو عالم حیوانی کے ارتقاء میں معین ہوتے ہیں، وہی اقوام انسانی پر بھی عامل ہیں، اور اس مسئلہ کی صحت کا یعنی اس امر کا کہ یہ اقوام ابھی حیوانیت کی سطح سے بلند تر نہیں سب سے بڑا ثبوت خود انھیں اقوام کا طرز عمل ہی، بلکہ اگر یہی رفتار حوادث قائم رہی تو کچھ عرصہ میں سب اپنے سے قوی تر حریف کا شکار بن جائیں گی کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایک ہی قوم ہمیشہ سب سے قوی تر رہی۔

لیکن ان کی یہی نفسانیت، جس کے باعث یہ ایک دوسرے کو اپنا شکار بنا رہی ہیں، انھیں حیوانیت کی پستی سے انسانیت کی بلندی کی طرف بھی لا رہی ہو، سبعیت کا فلسفہ، وحشی جانوروں کا اصولِ عمل، رفتہ رفتہ باہمی خلوص، ہمدردی و مواخات کے لیے جگہ خالی کرتا جاتا ہو اور تنازع للبقا تدریجاً تعاون للبقا کی صورت اختیار کر رہا ہو، اور سبعیت کے بعد "مجلس اقوام" کا زمانہ آ رہا ہو۔

اقوام کی مادی تاریخ اپنی منزل کی جانب لیے جا رہی ہو، وہاں تک پہنچنے کے لیے بے شک بہت زیادہ سعی و کوشش کی ضرورت ہو، لیکن جنگ و صلح کی کشمکش سے نکل کر بالآخر قومیں اس منزل کے قریب آتی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو گلے لگاتی جاتی ہیں وسعت ارض ان کے لیے تنگ ہوتی جاتی ہو، اور دنیا میں یکسانیت پیدا ہوتی جاتی ہو ان کے فضائل اور رذائل دونوں سب میں مشترک ہو گئے ہیں۔ ان کے بہترین کمالات میں سب مساوی شریک ہیں، علم و فن، حکمت و ادب کسی ایک قوم کی مخصوص مِلک نہیں، ان سب کے عقائد، تمدن، خاندان وغیرہ صدیوں کی جنگ و صلح کے بعد آپس میں مخلوط و مدغم ہو گئے ہیں، اسی طرح ان کے رذائل نے بھی ان میں اتحاد ہی پیدا کیا ہو ہر میدان جنگ میں خواہ فاتح خواہ مفتوح کی حیثیت سے انھوں نے اپنی لاشیں ایک ہی جگہ چھوڑی ہیں۔ اور ایک ناخوشگوار مواخات کی عمارت انھوں نے اپنے خون سے تعمیر کی ہے، نفرت، محبت ہی کی شکل معکوس کا نام ہو اور محبت ہی کا پہلا اور دھندلا پیغام ہو۔ نفرت کا پیدا کیا ہوا رشتہ اخلاص معاہدوں اور صلح ناموں سے کہیں بڑھ کر پائیدار و مستحکم ہوتا ہو، نفرت بھی بالآخر منزل اتحاد ہی کی طرف لے جاتی ہے، گو اس کے راستے تاریک و پیچ ہوتے ہیں، ایک

روزِ روشن آ کر ضرور رہتا ہے، جب انسان خود اس شے سے نفرت کرنے لگتا ہے جس نے اسے ایک دوسرے سے نفرت کرنا سکھایا تھا۔

جب باہمی منافقات ان قوموں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتے ہیں اس وقت انھیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپس میں کتنے تعلقات رکھتی ہیں۔ افتراق کے وقت انھیں نظر آتا ہے کہ ان میں باہم رشتۂ اتحاد بھی کیسا مضبوط تھا یہاں تک کہ اتحاد و اتفاق کی جن کڑیوں کی جانب پہلے خیال بھی نہیں جاتا تھا، وہ اب صاف نظر آنے لگتی ہیں، چنانچہ جو قومیں اس جنگ جہاں سوز سے الگ اور بے تعلق رہی ہیں، وہ بھی اس کے اثرات کو آج محسوس کر رہی ہیں اور اب انھیں یہ تجربہ ہو رہا ہے کہ اگر ایک عضو پر زخم آ جائے تو تکلیف سارے جسم کو ہوتی ہے۔

اس اتحاد و اشتراک نے آج سے زیادہ نمایاں شکل کبھی نہیں اختیار کی تھی موجودہ جنگ کی عالمگیری نے ثابت کر دکھایا ہے، کہ عالم انسانیت کا ذرہ ذرہ ایک دوسرے سے وابستہ ہے، انسانی زندگی کا کوئی بھی شعبہ تو ایسا نہیں جو اس جنگ کے اثرات سے غیر متاثر و غیر مختل رہا ہو، یہی وہ عام و مشترک قیادت ہے جو مستقبل عالم کا نظام تیار کر رہی ہے، اور اعلان کر رہی ہے کہ آئندہ اقوام کو اپنی حالت میں تبدیلی کرنا ہوگی، دورِ جدید کا آغاز ہو رہا ہے۔

دنیا پر ایک تازہ زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے، یہ لہر یورپ سے اٹھی اور امریکہ میں اس نے حرکت پیدا کی، اور ایشیا کو خواب سے بیدار کر دیا۔ خوش نصیب وہ قومیں جو اپنے طویل ایام مشقت کے بعد چین اور سکھ کی نیند سو سکیں گی اس لیے کہ باقی قوموں کے لیے اب گوشۂ لحد ہے۔

یہ لہر تمام کرۂ ارض کا چکر لگا کر پھر وہیں لوٹ آئی ہے، جہاں سے اٹھی

تھی، اور اب کی اس نے یورپ میں شعلۂ آتش کی شکل اختیار کرلی ہی اور قومی و نسلی غرور اسی شعلہ کی نذر ہو رہا ہی، یورپ کو باہر والوں کے ساتھ تحقیر کا برتاؤ ترک کرنا پڑے گا، اس لیے کہ قومی غرور کو یہ شعلہ جلا کر خاکستر کیے دیتا ہی، قوموں کو اس تخیل سے دست بردار ہونا پڑے گا، کہ وہ دوسروں کی حاکم یا آقا ہیں، اور بجائے اس کے اپنے تئیں انسانیت کا خدمت گزار تسلیم کرنا پڑے گا۔

مستقبل کی قوت اُن سے قطعاً یہی کام لیتی ہی، جنھیں اس کی خدمت گزاری سے انکار ہوتا ہی، البتہ جوں ہی ان سے اپنا کام لے چکتی ہی، انھیں ختم بھی کر دیتی ہی ماضی کی بڑی بڑی پُر ہیبت و جلال سلطنتوں سے اُس نے ان کی نادانستگی میں یہی کام لیا، اور کام لے چکنے کے بعد انھیں برباد کر دیا، یہی حشر موجودہ سلطنتوں کا بھی ہونا ہی اپنے جبر و ستم اپنی ناانصافیوں کے ذریعہ سے یہ قومیں اپنے مقصد و ارادہ کے خلاف مستقبل کا بھی مقصد پورا کرتی رہی ہیں، کہ نوع انسانی میں باہم اتحاد قائم ہو، مستقبل کی قوت ان کے ذریعہ سے یہ کام نکال کر اب خود ان پر اپنا عمل کر رہی ہی، یعنی ان قوموں کے جو جو حالات اس مقصد اتحاد کی راہ میں حائل ہوں گے، انھیں وہ فنا کر دے گی، اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ ہوگا کہ

چونکہ صدیوں کی جد و جہد کا مقصود یہی اتحاد بین الاقوام رہا ہی اور مستقبل کی منزل مقصود یہی عالم گیر اتحاد ہی، اس لیے وہی حکومتیں جن کی ساخت و ترکیب اس قسم کی واقع ہوئی ہی جو اس نصب العین کے حق میں معین ہو سکتی ہی، وہی حکومتیں برقرار رہ سکیں گی، اور وہی ترقی کی علمبردار ہوں گی۔

قومی تہذیب و تمدن کا معیار آئندہ سے یہی احساس اتحاد رہے گا، اور آئندہ انھیں افراد و اقوام پر متمدن کا اطلاق ہوگا، جو اس لیے متحد ہوئے ہیں کہ ہر فرد کو دوسرے فرد کا بھائی اور ہر قوم کو خاندان انسانیت کا ایک جزو تسلیم کریں۔

باب (۴)

حقوق اقوام

اوپر کہا جا چکا ہی، کہ جو تعلق فرد کو قوم سے ہی، وہی قوم کو عالم انسانی سے ہی۔ اس بنا پر جس طرح فرد کے لیے قوم کے فرائض ہیں، اسی طرح اس کے حقوق بھی ہیں وقت آگیا ہی کہ جن حقوق کے مطالبہ کی عزت فرد کی جانب سے سب سے پہلے فرانس کو حاصل ہوئی، انھیں حقوق کا اعلان اب اقوام سے متعلق بھی کیا جائے۔ اور فرد سے متعلق جن حقوق ثلثہ کو فرانس کے دست سیاست نے موجودہ تمدن کے دروازہ پر کندہ کر دیا ہی، وقت آگیا ہی، حقوق اقوام کا خلاصہ بھی انھیں تین لفظوں میں درِ مستقبل پر آویزاں کر دیا جائے۔

"حُریت، مساوات، اخوت"

سب سے پہلی چیز حُریت ہی، چھوٹی بڑی ہر قوم کو آزادی ملنا چاہیے۔ بڑی قومیں صرف وہ ہیں جو عالم انسانی کی بڑی خدمات انجام دیتی ہیں۔ اور اسی لحاظ سے کیوں نہ چھوٹی قومیں بڑی قوموں سے بھی بڑھ چڑھ کر خدمات انجام دیں۔

آزادی کس چیز کی؟ آزادی اپنے وجود کی، آزادی اس امر کے انتخاب کی کہ خواہ وہ الگ الگ آباد رہیں، خواہ کئی کئی آپس میں مل کر رہیں حقوق اقوام کی اصلی بنیاد و اساس کار یہی آزادی ہے، اور وہ حقوق سب اقوام کے لیے یکساں ہیں، یورپ و امریکہ، ایشیا و افریقہ کی ان میں کوئی تفریق نہیں،

اس کی بھی آزادی حاصل ہو، کہ ہر قوم اپنی سرشت، اپنے مخصوص مزاج و افتاد طبیعت کے موافق مدارج نشو و نما و ارتقا، طے کر سکے۔ جس وقت کسی ایک قوم کو بھی اس کے گوناگوں مظاہر و شئون میں سے کسی ایک شئے کو بھی عدم تکمیل تک پہنچانے سے روکا جائے گا۔ انسانیت کے سرمایہ میں اسی وقت سے افلاس کا داغ لگ جائے گا۔

ہاں آزادی اس کی ہونی چاہیے کہ ہر قوم اپنے اپنے مذاق کے مطابق پھلے اور پھولے، اتحاد کے یہ معنی نہیں، کہ سب کو ایک ہی قالب میں ڈھال دیا جائے ہر آئین اور ہر نظام کو اپنی زندگی کے ثبوت دینے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔

غرض ہر قوم کو زندگی ملنا چاہیے، اور جس نوعیت و طرز کی زندگی اسے مرغوب ہو، وہی ملنا چاہیے اپنی جماعتیں بنا کر یا جس طریقہ پر بھی وہ اپنی تنظیم کرنا چاہیں سب قوموں کو زندہ رہنا چاہیے اور اس وقت تک زندہ رہنا چاہیے جب تک وہ منفرداً یا مجموعاً اس شئے کی خدمت کرتی رہیں جو ان سب سے افضل و برتر ہے یعنی تمام اقوام کا آغوش مادر عالم انسانی،

"مساوات" تمام قومیں بہ لحاظ حقوق مساوی ہیں، حق کے سامنے سب برابر ہیں یہی مساوات ایک دوسرے کے مقابلہ میں ان کی آزادی کا ضامن نامہ ہے، اس اقرار نامہ پر سب کے دستخط ثبت ہیں، متمدن افراد کی طرح متمدن اقوام

میں بھی کسی ایک کے ساتھ نا انصافی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سب کے حقوق کو صدمہ پہنچا، اس کے متعلق ہر قوم میں مساوی احساس پیدا ہونا چاہیے۔ بلکہ اگر کسی کمزور کے ساتھ نا انصافی کی گئی ہو، تو پُر قوت قوموں کو اور زیادہ اسکا احساس ہونا چاہیے۔

اگر عدل نہیں، اگر سب کے لیے مساوی انصاف نہیں، تو نہ کسی متمدن فرد کا وجود رہ سکتا ہے، نہ کسی متمدن قوم کا، اس عدل کی پیش گاہ میں زبردست زیردست قوی و ضعیف سب کے حقوق بالکل مساوی ہونے چاہئیں، اسی لیے کہ حقوق کا معیار طاقت و قوت نہیں، حق کے حقوق طاقت و قوت سے کہیں اعلیٰ و افضل ہوتے ہیں۔

کمزور کے مقابلہ میں قوت کا اظہار نہ کوئی متمدن فرد کر سکتا ہے، نہ متمدن قوم، کوئی ہستی بجائے خود عدل کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتی، عدل کی تعریف یہ ہے کہ ہر ہستی ہر دوسری ہستی کے مقابلہ میں پورا انصاف حاصل کر سکتی ہو۔

مساوات حقوق سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ان حقوق کی نیابت میں بھی سب مساوی ہیں، اس قانون کے وضع کرنے میں جو ان سب پر حاوی ہے سب کی شرکت مساوی ہونا چاہیے۔ اور اس قوم اعظم (یعنی عالم انسانی) کی حکومت میں، جس کی یہ سب قومیں جزو ہیں سب کو برابر کا حصہ دار ہونا چاہیے،

اس بنا پر انسانیت کی پارلیمنٹ کی ترکیب میں محض مخصوص اقوام کا نہیں بلکہ کل اقوام کا شمول لازمی ہے، انجمن اقوام میں چھوٹی بڑی امیر و غریب، مالک و مملوک، ہر قوم دوسرے کے مساوی جگہ رکھتی ہو اور مالک و مملوک کیا معنی سرے سے یہ تفریق بھی مٹ جائے گی اور اس سے حاکم اقوام کو اندیشہ کی کوئی وجہ نہیں،

اس لیے کہ اگر ان کا غلبہ بجا و حق بجانب ہی تو اس کے لیے بجز علم و عقل کے اور کسی سہارے کی حاجت نہیں، آلات و اسلحہ کی قوت سے بڑھ کر روحانی طاقت ہی، پھر اگر مجلس اقوام میں اکثریت ان کی جانب نہیں بلکہ وہ اپنے تئیں اقلیت میں پاتی ہیں، تو بھی کیا مضائقہ ہی، دنیا کی رہبری و سرداری ہمیشہ مختصر و چیدہ جماعات ہی کرتی آئی ہیں، اور جس وقت تک وہ دوسروں سے ممتاز ہیں، سرداری بدستور ان کے ہاتھ میں رہی گی، البتہ اس سرداری کی بنیاد عدل و اخوت پر قائم ہوگی۔

"اخوت" اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دوسرے کا ادب ملحوظ رہی، اور باہم نفع رسانی کی کوشش رہی، تمام ممالک ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ مادرِ گیتی سب کی مشترک ماں ہی، وہ کرۂ ارض کے کسی خطہ میں بھی واقع ہوں، ایک ہی آفتاب سب کو روشنی پہنچاتا ہی، کوئی قوم کسی حصۂ زمین میں آباد ہو، سب کو ایک ہی منزل تک پہنچنا ہی کیوں نہ موت سے پیشتر زندگی ہی میں سب ایک دوسرے کو متحد سمجھیں۔

اب تک حب الوطنی کا مفہوم یہ رہا ہی کہ دوسروں کے ساتھ اگر نفرت نہیں تو کم از کم مغائرت و حقارت کا برتاؤ ضرور کیا جائے، درآنحالیکہ یہ تمام اقوام مختلفہ ایک ہی اصل انسانیت کی مختلف شاخیں اور ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر و شئون ہیں، سچا محب وطن وہ ہی جو اپنی قوم میں انسانیت ہی کا عکس دیکھتا ہی، لیکن کیا ممکن نہیں کہ دوسری قوموں میں بھی وہ یہی عکس دیکھے، وہ دن آ رہا ہی، جب ہر شخص دوسرے ممالک کو اپنا ہی وطن سمجھنے لگے گا اور ہر ملک اسے خاندان انسانی ہی کا ایک مسکن نظر آنے لگے گا، ایسی حالت

میں وہ دوسرے ملک میں پہنچکر اپنے میزبان سے اجنبی کا سا برتاؤ نہیں کرے گا بلکہ وہ طرز عمل رکھے گا جو ایک دوست کا دوسرے دوست سے ہوتا، یا اولاد کا اپنی والدہ کے خاندان والوں کے ساتھ،

اُس وقت زمین پر جاسوسوں اور مخبروں کا وجود نہ ہوگا، اس وقت کسی قوم کو اس کی ضرورت نہ باقی رہے گی کہ وہ دوسرے ممالک میں مشہور و معروف لیکن مجہول و مخفی اشخاص لگائے رکھے جو دھوکا دینے میں مشاق اور دھوکا کھانے کے اچھی طرح خوگر ہوں، اور جن کا کام یہ ہو کہ مصالح کی آڑ میں نہایت غیر مصلحت اندیشانہ کارروائیوں میں مصروف رہیں، اس وقت قومیں بجائے ایک دوسرے کے مخفی دشمن ہونے کے آپس میں مراسم ارتباط و اتحاد قائم کریں گی، اس وقت ان کے سرکاری نمایندہ (کانسل، سفرا وغیرہ) چالاک قومی جواری نہ ہوں گے، جو قوموں کی زندگی و موت پر بازی لگایا کریں گے۔ بلکہ دانش مند و راست باز مشیر ہوں گے، اور سب کے مشترک فوائد کے نگراں و وکیل ہوں گے جن کی مجلس ہر قوم میں گویا انسانیت کی مجلس ہوگی،

کیا اس مرتبہ تک پہنچنا بہت دشوار ہے؟ کیا موجودہ متمدن اقوام سے اس کی توقع کرنا ایک امر محال کی توقع رکھنا ہے، کہ وہ متمدن افراد کے نظام اخلاق کے مطابق عمل کریں؟ اور اس طرح ایک دوسرے کو اس بارِ وحشت سے سبکدوش کریں، جو اس وقت ان سب کو کچلے ڈالتا ہے۔

حریت، مساوات و اخوت کے ان اصول ثلثہ کے علاوہ کسی اور اصول پر موجودہ اقوام کی حیات مستقبل کے معنی یہ ہیں، کہ ان کے نصیب میں غلامی، ذلت و فساد کی زندگی ہے،

آزاد، مساوی و برادرانہ تعلقات قائم رکھنے والی اقوام کے دائرہ جمہوریت سے باہر ہونے کے بعد درحقیقت اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہ جاتا کہ نوع انسانی کو باہمدگر رقیبانہ تعلقات قائم رکھنے والے حصوں میں تقسیم کردیا جائے، یعنی چند قوی ہیکل و مستبد ٹکڑیاں قائم ہوجائیں گی، جن کے مقابلہ میں موجودہ سلطنتیں ہیچ ہیں اور جن کے آگے آج کی ہر چھوٹی بڑی سب ہی اقوام کو سر جھکا دینا ہوگا، ان ٹکڑیوں کے درمیان مستقل جدال و قتال قائم رہے گا، جو اس قدر ہولناک ہوگا کہ اس کے سامنے موجودہ جنگ کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔

اقوام آج جس راستہ پر چل رہی ہیں، وہ اس منزل کی طرف لے جانے والا ہے اور اس قسم کے ہیبت ناک اژدر نما سیاسی و جنگی ہستیوں کے وجود میں آنے کے آثار ابھی سے پیدا ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

لیکن فطرت اژدروں کو دوست نہیں رکھتی، ان کی زندگی محض عارضی اور مخصوص مقاصد کے لیے ہوتی ہے، طبقات ارض سے جن اژدروں کے ڈھانچ آج نکل رہے، وہ کتنی مدت تک زندہ رہ سکے، یہی حشر ان دیو ہیکل ہیبت فگن نظامات کا بھی ہونا ہے جو حکومتیں اپنے اجتماع سے قائم کر رہی ہیں، جونہی ان کا مقصد حیات پورا ہوچکے گا ان پر فنا طاری ہوجائے گی۔

ان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ اقوام کو کسی بہتر حالت کے لیے تیار کیا جائے، انھوں نے قوموں کے سامنے ابھی سے اپنا ہیبت ناک وجود ظلّی پیش کرنا شروع کردیا ہے، تاکہ بداعمالیوں کے جو نتائج پیش آنے والے ہیں ان سے سب باخبر ہوجائیں، انھوں نے سر دست اقوام کی مطلق العنانی کو کچھ تو کم کر کے ان کی خودی کو اس غرض کے لیئے دبایا ہے، جو آئندہ آزادانہ جمہوریت اقوام کی تنظیم کے

لیے ضروری ہے، اور انھوں نے موجودہ کشمکش کی وہی صورت پیدا کر رکھی ہے، جو پیدا ہونی چاہیے تھی، یعنی دہشت ناک، اس قدر کہ آیندہ سب کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جائے، خوں ریز اس قدر کہ تمام پچھلے نظامات تہ وبالا کر دیے ہیں اور عالمگیر اس قدر کہ دنیا کا کوئی گوشہ آیندہ آزادی کی نعمت سے محروم نہ رہنے پائے۔

اب اقوام کے سامنے صرف دو راستے ہیں، یا تو باہمی جنگ و ہلاکت کے لیے مسلح اتحاد اختیار کریں، اور یا امن و آشتی کے ساتھ آزادانہ اتحاد سب مل کر قائم کر لیں ان میں سے ایک شے کا انتخاب کرنا ہے۔

باب (۵)

امنِ عالم

مدتوں سے انسان کو اس کا احساس ہے، کہ نظام کائنات کے اس ادنیٰ ترین جزو، کرۂ ارض پر حیات چند روزہ پاکر آپس میں لڑنا جھگڑنا، سعی و اہتمام کے ساتھ تفریق اور تفریق در تفریق قائم کرنا، اور بجائے باہمی خلوص و معاونت کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے کے اجل کی دست بُرد میں معین ہونا، کس قدر حماقت بلکہ جنون ہے،

مدتوں سے وہ اس جنون کے ازالہ، اس مرض کے دفعیہ کی فکر میں ہے لیکن اب تک کامیابی نہیں ہوئی یہ آخر کیوں؟

حکمائ نے برکات صلح بیان کئے، انبیاء نے پیام امن کی منادی کی تاہم دنیا ابھی تک اس کی آمد کا راستہ ہی دیکھ رہی ہے، اس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ امن کوئی ایسی شے نہیں جو من و سلویٰ کی طرح آسمان سے نزول کرے بلکہ انسان کے احساس انسانیت کا نتیجہ ہے، اور انسانیت کے احساس سے اس وقت تک قلوب انسانی نا آشنا ہیں،

بڑی بڑی سلطنتوں نے ہمت کی کہ دنیا میں امن قائم کردیا جائے۔ بڑے بڑے فاتحوں نے منصوبہ باندھا کہ اپنے زور و قوت سے دنیا میں امن قائم کرکے رہیں گے، لیکن ان ہمتوں کو زرہ آہنی کے بار نے توڑ توڑ دیا اور یہ خواب ہمیشہ چھوٹے ہی نکلے اس لیے کہ امن کا جنگ سے اور نرمی کا سختی سے پیدا ہونا محال ہی ہو، یہ ناممکن ہو کہ جنگ سے صلح پیدا ہو سکے۔

آج پھر قوموں میں یہی پرانا منصوبہ تازہ ہو رہا ہو، وہ یہ سمجھتی ہیں کہ یہ جنگ آئندہ جنگوں کا خاتمہ کردے گی اور عسکریت کی یہ طاقت ہمیشہ کے لیے عسکریت کا زور توڑ دے گی۔

اگر آج علاج بالمثل کے اس مہمل اصول میں کچھ بھی صداقت ہوتی، تو مدت ہوئی دنیا سے جنگ رخصت ہو چکی ہوتی، یہ لوگ اس وہم میں گرفتار ہیں کہ ایک حربی فتح دنیا میں صلح قائم کردے گی، حالانکہ دنیا کی صلح وہ صلح نہیں، جس کے شرائط فاتح یا قوی ترین فریق مرتب کرے، دنیا قدیم دمیوں کے شرائط صلح کی پابندی نہیں کر سکتی، دنیا کو جس شے کی ضرورت ہی، اور جس امر کا انتظار ہی، وہ نوع انسانی کی صلح ہی۔ جس پر دستخط مفتوح اقوام کے نہیں بلکہ آزاد اقوام کے ثبت ہوں گے، اور جس کے شرائط خود انسانیت کے ایماء سے مساویانہ تمام اقوام کو املا کیے جائیں گے۔

دنیا میں قیام امن نہ تو فوجی طاقت سے ہو سکتا ہی، اور نہ فرقہ مصالحانہ[۱] کی کمزوریوں سے اس فرقہ کو روشن ترین توقعات کے باوجود جیسی ناکامی ب

---

[۱] یورپ میں ایک گروہ PACIFIST کے نام سے موجود ہے۔ جو ہر قسم کی جنگ جوئی کا سخت مخالف ہے۔ م

نصیب ہوئی، پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی، سرکاری حیثیت سے تمام قومیں اور ان کے حکمران تک بھی یہی بولی بولنے لگے تھے، اس پیام کی منادی خود زار تک نے کی تھی، اور اسی کی اپیل کے مطابق دوسری سلطنتوں نے اپنے ہاں اس غرض کے لیے مجلسیں منعقد کیں، صلح و امن کے نام سے ایک مندر تعمیر کیا گیا[1] مگر اسی تاریخ سے ان ہولناک محاربات کی بنیاد پڑ گئی، جن کی نظیر سے تاریخ عالم خالی ہو۔

یورپ کے تمام قانون سازوں نے قوانین کی مدد سے بڑی بڑی عدالتیں قائم کردی ہیں کہ وہ فصل خصومات کے بجائے طاقت و قوت کے حق و استحقاق کی بنا پر کریں، اور جنگ تک کے آئین و ضوابط مقرر کردیے ہیں، تاکہ غلبہ قوت کے وقت بھی حق کا عنصر شامل رہے۔ با ایں ہمہ شاید آج سے زیادہ قوت حق پر کبھی غالب نہ آئی ہو،

تمام ممالک کے طبقہ عمال (مزدور پیشہ گروہ) نے جنگ کے خلاف اتحاد کرلیا تھا، انھوں نے ایک دوسرے سے حلف لے لیا تھا کہ بہ صورت جنگ سب بغاوت کردیں گی، ان کی مرکزی بین الاقوامی مجلس گویا امن و صلح کی ایک قطعی ضمانت تھی، لیکن آج وہی لوگ ایک دوسرے کے قتل میں مصروف ہیں اور جن زبانوں پر کل تک مواخات کی تعلیم تھی، وہی آج مقابلہ میں مشغول رجز خوانی ہیں،

تمام قوموں نے جنگ سے محفوظ رہنے کے لیے کثرت سے معاہدے و اتحاد نامے مرتب کرلیے تھے، اور "قیام امن" کے لیے صلح ناموں کی تعداد حد سے بڑھ چلی تھی لیکن آج جنگ کی خبیث روح ہر سمت سے مجتمع ہوکر خشک مقامات

---

[1] یہ اشارات ہیں، ہیگ کی عدالت صلح کی جانب۔

میں اپنا گھر پیدا کر رہی ہے، اور اپنے ہمراہ اپنے سے خبیث تر روحوں کو اور لیے ہوئے ہے، اس وقت موجودہ قومیں ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں مشغول ہیں[۵۱]۔

فرقہ مصالحانہ اس وہم میں مبتلا تھا، کہ روز افزوں اقتصادی مادیت اور فوجی دمدموں کی افراط سب اسی کی تائید میں ہے، گویا خدایان تجارت کی خدائی میں آئندہ کے میدان کارزار محض تجارتی منڈیاں رہ جائیں گی، آئندہ کے محاربات محض تجارتی مقابلہ و مسابقہ ہوں گے آئندہ کے فتوحات محض افزائش پیداوار کے مرادف ہوں گے، دنیا کی رہنمائی اسی دنیا کے تجارت سے کی، یہی اقتصادی جنگ اس وقت تک دو کروڑ جانیں لے چکی ہے[۵۲] اور مال کا جتنا نقصان ہوا ہے، وہ اندازہ سے باہر ہے، پیداوار نے بالآخر خود اپنے پیدا کرنے والوں کو ہضم کر لیا۔

پھر یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جدید آلات ہلاکت و مہلک سامان حرب کی دہشت ایسی دلوں میں جاگزیں ہو جائے گی کہ لڑائی چھیڑنے کی کسی کو ہمت ہی نہ ہوگی، لیکن اب تو تجربہ ہو گیا کہ پورے پچیس مہینوں سے مالک دوزخ نے دنیا پر جہنم کے دروازے کھول رکھے ہیں، اور ہر طرح کے عذاب و عقوبت کی بارش ہو رہی ہے، بایں ہمہ آگ کے شعلے بجائے ماند پڑنے کے اور تیز ہوتے جاتے ہیں۔

آخر یورپ کے اس صلح جو فرقہ کی کوششوں کی ناکامی کامل کا کوئی سبب؟

---

[۵۱] حسب ذیل چودہ[۱۴] ممالک نے اس جنگ عظیم میں حصہ لیا۔

جرمنی[۱]، فرانس[۲]، روس[۳]، آسٹریا[۴]، انگلستان[۵]، اٹلی[۶]، امریکہ[۷]، جاپان[۸]، ترکی[۹]۔ بلگیریا[۱۰]، بلجیم[۱۱]، سرویا[۱۲]، مانٹی نیگرو[۱۳]، پرتگال[۱۴]۔

[۵۲] یہ تخمینہ ۱۹۱۷ء کا ہے۔ م

بے شک اس کے اسباب ہیں، جن میں سب سے پہلا سبب یہ ہے، کہ یہ ایک محض یورپین فرقہ تھا، ان اقوام کا، ان کے مقننوں اور مدبروں کا، ان کے عمال اور ان کے فرماں رواؤں کا منتہائے مقصود امن نہ تھا امن کامل نہ تھا، بلکہ محض آپس کا امن، خود غرضانہ امن تھا اس قسم کی جھوٹی صلح کی کوششیں ہمیشہ ناکام رہیگی ہیگ میں ان کی "عدالت صلح" بے شک قائم تھی، لیکن اس عدالت کا انصاف ان شامت زدوں کے لیے نہ تھا، جن کے دور افتادہ ممالک پر ندان آزتیز ہو رہے تھے، اس محکمہ انصاف کے ضوابط میں ان غیر مسلح آبادیوں پر فوجی تسلط قائم رکھنا ذرا بھی حقوق اقوام اور احترام تمدن کے منافی نہ تھا جن کا رنگ سفید نہ ہو، یہ کھلی ہوئی حق تلفیاں ہوتی رہیں، اور کسی ایک سوشلسٹ[ل] نے بھی بغاوت کا ارادہ تک نہ کیا، غرض صلح و امن کی ہر تدبیر میں یہ مقصد کبھی نظر سے نہ ہٹنے پایا، کہ ہر سلطنت کی ہوس استعمار و شوق ملک گیری کے لیے نذر ہونے کو کوئی جدید علاقہ تیار رہے، فرقہ صلح جو نے بھی کبھی اس جانب توجہ نہ کی، اسے اپنے محدود دائرہ سے باہر توجہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی، وہ اس حقیقت کو فراموش کیے رہا، کہ "جو شمشیر حملہ کر رہی ہے، کل اس پر بھی حملہ کیا جائے گا۔"

مستقل و ممکن امن صرف وہی ہے جو سب کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں حاصل ہو جس وقت تک دنیا میں ایک قوم بھی ہدف جنگ بنی ہوئی ہے، دوسروں کو امن و سکون سے رہنا ناممکن ہے، یورپ کی یہ تمنا تھی کہ خود یورپ میں صلح رہے درآنحالیکہ یورپ ہی کی حکمت عملی دوسرے اقطاع ارض میں انسان کا خون بہاتی رہی، آیندہ صلح نامہ پر موجودہ متحاربین کا دستخط کر دینا بالکل لاحاصل

[ل] اشتراکی، یعنی اس گروہ کا رکن جو عالم کی دولت میں مساوات و اشتراک پیدا کرنے کا مدعی ہے،

رہے گا، تاوقتیکہ اس پر دنیا کا باقی حصہ بھی دستخط نہ کرے، تاوقتیکہ آئندہ مجلس صلح میں عالم انسانی کی پوری نیابت نہ ہو، امن کی بخشش صرف انسانیت کے ہاتھ میں ہے انسانیت اسے اقوام کو عطا کر سکتی ہے، بشرطیکہ اقوام اسے اپنی مجلس کا صدر بنائیں،

اگر صلح منظور ہے، تو پہلے اپنے غلاموں کو آزاد کرو، کہ وہ تمھارے برابر بیٹھ کر گفتگو کر سکیں، ورنہ صلح کا نام نہ لو،

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے قلوب، اپنے نفوس کو آزاد کرو، جنگ و صلح کا اصلی مبدأ و ماخذ خود تمھارا قلب ہے، اگر صلح کا وجود تمھارے قلب میں نہیں، تو فرقۂ صلح جو کی تمام کوششیں قطعاً لاحاصل ہیں، جنگ پیدا ہو گی، اور وہ اپنی رَو میں سب کو بہالے جائے گی۔

نظامات، قوانین، محکمہ جات ثالثی بین اقوامی معاہدے، اقرار نامے اور مجلسیں شرح زر میں اضافہ، اقوام کے تعلقات باہمی میں افزائش صلح کو ترقی دینے والے اسباب و حالات ...... سیلِ ہلاکت کی روک تھام کے لیے کتنے مضبوط بند قائم کر دیے گئے تھے، لیکن جب یہ سیلاب موجزن ہوا تو تمام بند توڑتا ہوا اپنے ہمراہ بہالے گیا، بلکہ جتنے زائد یہ بند قائم کئے گئے تھے، اتنا ہی رُک رُک کے سیلاب کے حجم میں اضافہ ہوتا رہا، اور اسی قدر زیادہ تندی و قوت کے ساتھ اس کا بہاؤ چلا، اگر فی الواقع اس کی روک تھام منظور تھی، تو اس کے منبع کو خشک کرنا چاہیے تھا، حالانکہ یہ تمام بندشیں ظاہری و خارجی تھیں، لوگوں نے چاہا کہ خارجی ذرائع سے امن کو وجود میں لائیں، حالانکہ یہ شے ان کے بس کی نہیں، امن کا مولد و منبع قلب انسانی ہے، جنگ کا منبع بھی قلب انسانی ہے۔ انسان کی انسانیت سے بے گانگی، انسان میں دوسروں کے مساوی ہونے کا عدم احساس انسان کا قلب ہی وہ سر چشمہ ہے، جہاں سے سیلاب خون نکل کر تمام کرۂ ارض پر جوش زن

ہوتا ہے اسی سرچشمہ کو خشک کر دینے سے دنیا سے جنگ کا وجود رخصت ہو سکتا ہے تاوقتیکہ انسان کے باطن میں، انسان کے نفس میں اصلاح نہ ہوگی، تمام خارجی تدابیر تمام بیرونی کوششیں لاحاصل رہیں گی، اور امن وصلح کے ظاہری قالب کے اندر جنگ وبدامنی کی روح حرکت کرتی رہے گی۔

اب آنکھوں سے پردے ہٹ گئے ہیں اور ساتھ ہی امیدوں کا طلسم بھی ٹوٹ گیا ہے، قدیم حالات کو بدستور رکھنا امن کے لیے کافی نہ تھا، راضی نامہ کر لینا امن کے مرادف نہیں، قدیم حالات کے فنا ہونے کے ساتھ فرقہ صلح جو کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے لیکن اس کی یہ ناکامی آیندہ کامیابیوں کے لیے بھی دلیل راہ کا کام دے رہی ہے، حصول کامیابی کے لیے اس شمشیر بے پناہ کا وجود ضروری تھا، جو ہڈیوں تک پیوست ہو جاتی ہے، چنانچہ جنگ اسے تیار کر رہی ہے، یہ شعلہ شمشیر خود شمشیر قتال کو بھی خاکستر کر کے رہے گا۔

وہ مقصد جسے بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے مذاہب زمانہ ماضی میں پورا نہ کر سکے، جس کے انجام دینے میں زمانہ حال کا تمدن ناکام رہا مگر جس کی تیاریاں تمام گزشتہ صدیاں کرتی آئی ہیں وہ ایک سے اور صرف ایک شے سے ابھی اتمام کو پہنچ سکتا ہے آج حاصل ہو سکتا ہے، وہ شے کیا ہے؟ انسان میں انسانیت کا احساس، جزو کو کل کا شعور۔

اس وقت انسان کے قلب سے امن عالم کی پیدائش ہوگی،

باب (۶)

بیداریٔ روح

ایک آواز صدیوں سے آرہی ہے، یہ آواز ضمیر کی گہرائیوں سے پیدا ہو رہی ہے سب نے اس کو سنا ہے مگر اس پر کان اب تک کسی نے نہیں رکھا ہے اس آواز کو خاموش کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں یہ صدا سب سے اعلیٰ تر فرمان کی منادی کر رہی ہے کہ "ہلاک نہ کرنا"۔

ایک دوسری صدا، صدائے خوف زمین سے بلند ہو رہی ہے، آہ جنگ کے شدائد و مصائب! زبان انھیں بیان کرنے سے بھی قاصر ہے! اُف وہ جرائم و معاصی جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے! کیا شکل انسانی کے عقب میں کوئی اژدر پوشیدہ ہے؟ ورنہ آخر اس قدر ترقیٔ تمدن کے ساتھ اس بہیمیت کا اجتماع ممکن کیونکر ہے؟

یہ واقعات ممکن کیوں ہیں؟ محض اس لیے کہ دنیائے متمدن کے ہر شہر، ہر قصبہ ہر گاؤں میں مدارس موجود ہیں، جہاں چھوٹے بچے پڑھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور وہاں استاد انھیں روزانہ یہ درس دیتا ہے کہ انسان کا اہم ترین

فرض یہ ہو کہ قومی اغراض کی پاسداری کرے اور اگر قومی اغراض اسی کے مقتضی ہوں تو اپنے ہم جنسوں کا گلا کاٹنا اس کے لیے کار ثواب ہو جاتا ہی، اور اس پر اپنے حاکم کی جو قتل کے لیے ابھارتا ہو تعمیل ارشاد زیادہ فرض ہو بہ مقابلہ اس زبان ضمیر کے کہ "ہلاک نہ کرنا"

ہاں اس لیے کہ چونکہ ہر شخص کو بچپن ہی سے اس قسم کی تعلیم ملتی ہی۔ ہر قوم میں ہر شخص اس کے لیے تیار ہو جاتا ہو کہ ایک روز قاتل بنے اور اپنے بھائی کے حق میں قصائی کا کام دے اس کے بعد کوئی جرم اس کے لیے جرم نہیں باقی رہ جاتا اور نوازل و مصائب جنگ کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی۔

اور آخر ان نوازل و مصائب کو متعین حدود کے اندر محدود رہنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہی؟ خود ہی تو ایک جنگی درندہ کو آزاد چھوڑ دیتے ہو اور پھر اس سے یہ توقع کرتے ہو کہ وہ انسانیت کے حدود میں رہو گا! بلکہ جنگ کا اس حد تک وحشیانہ و بہیمانہ ہو جانا تو بہت اچھا ہوا، کہ بغیر اس کے انسان کے دل میں اسکی طرف سے نفرت ہی نہیں پیدا ہو سکتی تھی، انسان کے دل میں اب تک قتل انسانی کی عزت تھی لیکن جتنی چیزیں اس کی نظر میں جنگ کو زیادہ وحشیانہ ثابت کر رہی ہیں وہ دراصل اس روز سعید کی آمد کو قریب لاتی جاتی ہیں، جب قتل انسانی کے جواز کا امکان نہ باقی رہی گا، اور قدیم جنون رخصت ہو چکا ہو گا،

———— ٭ ————

قتل حرام ہی ہر حالت اور ہر صورت میں حرام ہی جب یہ قطعی فتوی صادر ہو جائے گا اس وقت دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو گا،

جس وقت تک اس فتوی میں استثنا کی کوئی صورت باقی ہی جس وقت

یہ خیال قائم ہو کہ بڑی جماعت مرتب کر کے قتل کرنا جائز ہو۔ جس وقت تک یہ وہم موجود ہو کہ جماعات کا قتل افراد کے قتل سے مختلف بلکہ ایک عمل شریفانہ ہو اور جس وقت تک یہ اعتقاد باقی ہو کہ تنخواہ پانے والوں اور وردی پہننے والوں کے پاس دوسروں کی جان لینے کے لیے پروانۂ جواز ہو، اس وقت تک جنگ کا وجود بھی برقرار رہے گا، اور جنگ بھی مع اپنی تمام شقاوتوں کے

جس وقت تک متمدن افراد کے نفوس میں قاتلانہ عظمت کا احساس زہریلی تعلیم کے اثرات سے پیدا شدہ باقی ہو جس وقت تک اصول اخلاق اس بدترین بد اخلاقی میں معین ہو رہے ہیں جس وقت اساتذہ و معلمین اپنے تلامذہ کے دل و دماغ پر محاربات اور معرکہ آرائیوں کی عظمت و شوکت کے نقوش بٹھا رہے ہیں، جس وقت تک اس ام الجرائم کو جرم و معصیت کی حیثیت میں نہیں لایا جاتا اور قتل و خونریزی کو بدترین معصیت کی شکل میں نہیں پیش کیا جاتا، جس وقت تک یہ صورت حال باقی ہو اس وقت تک باہمی قتل و ہلاکت کی لعنت اپنی تمام شقاوتوں اور بیدردیوں کے ساتھ قوموں پر مسلط رہے گی۔

اس سے بھی بڑھ کر ستم یہ ہو کہ مدارس میں زبانی اسباق کے علاوہ ان چیزوں کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہو، سب سے پہلے تو اس کی مثال ہمارا قانون معاشری ہی پیش کرتا ہو جس وقت تک قانون، نفس بشری کی عظمت اور حیات انسانی کا احترام مجرموں تک میں نہ تسلیم کرے گا، جس وقت تک تعزیرات کا نفاذ خود جرائم کی شکل میں ہوتا رہے گا جس وقت تک کسی خونی کے پوشیدہ جرم کے جواب میں دوسرا خون علانیہ اور بہ کمال بیدردی کیا جاتا رہے گا، اس وقت تک اس خون کی چھینٹیں جسے جلاد کی جنبش شمشیر نے

بنایا ہے، بارش کے قطرات بن کر تمام عالم پر برستی رہیں گی اور خونی کو جو قتل کی سزا دی جاتی ہے۔ اس سزا کی سزا میں جنگ کا دیوتا لاکھوں بے گناہوں کی جان لیتا رہے گا،

یہ وہ پیام ہے، جو انسانیت تمام اقوام کو دے رہی ہے۔

وہ دن آنے والا ہے جب ان چیزوں کا خاتمہ ہوگا، اس لیے کہ "ہلاک نہ کرنا" کی صدا اب کسی غیر کی، کسی باہر والے کی صدا نہیں رہی ہے، یہ صدا خلقت کے قلب سے بلند ہو رہی ہے، انسانیت کا یہ پیغام اب نفوس میں زندہ ہو رہا ہے، اور دنیا کو ایک نئی ہدایت کر رہا ہے، اس کی تعلیم ایک بلند تر فرض "فریضۂ انسانیت" کی تعلیم ہے۔

سیکڑوں ہزاروں برس میں انسان نے اتنا سیکھا کہ قوم و ملک کے حقوق، خاندان کے حقوق سے افضل و برتر ہیں، محبت وطن کا مرتبہ خاندان سے بڑھا ہوا ہے، اور وطن کی خدمت پر اپنی جان اور اپنے خاندان کو قربان کر دینا چاہیے اب ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہیے، اب اسے یہ تعلیم حاصل کرنا چاہیے کہ حقوق انسانیت، حقوق وطنیت سے بھی بالاتر ہیں، اور محبت خلق کا مرتبہ محبت وطن سے کہیں بڑھ کر ہے، انسان کو اپنی جان بے شک قربان کرنا چاہیے مگر اس شے پر نہیں کہ اس کے وطن کو کوئی بات حاصل ہو، بلکہ اس شے پر کہ عالم انسانی میں اس کے وطن کو کوئی مرتبہ حاصل ہو،

جوں جوں انسان کے دل میں اس وطنِ اعظم کا خیال راسخ ہوتا جائے گا۔ اسی مناسبت سے اس میں انسانیت کا درد و احساس بھی بڑھتا جائے گا۔ انسان حقیقتہً صرف وہ ہے جس میں انسانیت کا احساس موجود ہے، جس کا

قلب یہ آواز دیتا رہتا ہو کہ "میں پہلے انسان ہوں، اس کے بعد انگریز، جرمن، روسی یا جاپانی ہوں محبِ وطن ہونے سے پیشتر میں انسان ہوں، میرا سب سے مقدم فرض انسانیت کا ہو، اس کے بعد کسی ملک کے باشندہ ہونے کا۔"

قانون انسانی کی سب سے اہم دفعہ یہ ہو کہ ہر شے پر انسانیت اور حیات بشری کا احترام مقدم ہو، اور انسان کے لیے سب سے بڑی شریعت یہ ہو کہ "ہلاک نہ کرنا۔"

اپنے ملک کے لیے جان دینا، بہ مقابلہ اپنے خاندان کے لیے زندہ رہنے کے بے شک ایک بڑی بات ہو، لیکن اپنے ملک کے لیے جان دینے سے بڑھ کر یہ بات ہو کہ کسی دوسرے کی جان نہ لی جائے، کسی حالت میں اور کسی موقع پر بھی۔

اسی جنگ کے دوران میں ایسے اشخاص نکلے ہیں، جو اس معیارِ انسانیت پر بالکل پورے اترے ہیں۔ انھوں نے اپنی جان دیدینا قبول کیا، لیکن دوسرے کی جان لینا گوارا نہ کیا، وہ قلب پاکیزہ اور غیر خون آلودہ ہاتھوں کے ساتھ دنیا سے اٹھ گئے، وہ انسانیت کی روح میں شامل ہو گئے ہیں اور اسی کے ساتھ ابدالآباد تک زندہ رہیں گے۔

انسانیت ایک زندہ وجود ہو، وہ نابینا ہیں جو اسے محض ایک لفظ سمجھتے ہیں، افراد و اقوام کی طرح وہ ایک حقیقی وجود رکھتی ہو اور اپنے وجود کا احساس رکھتی ہو خواہ اقوام و افراد اس کے وجود سے بے خبر ہوں، سب کی اصلی ماں وہی ہو جو اپنے بطن سے سب کو پیدا کرتی ہو، اپنے آغوش میں سب کی پرورش کرتی ہو، اور جس کے اوپر سب کی زندگی کا انحصار ہو، یہ اسی کی قوت ہو جو اقوام میں زندگی قائم کیے ہوئے ہے یہ اسی کا خون ہو جو سب کی رگوں میں دوڑ رہا ہو۔

یہ زندہ ہستی ایک زندہ جسم بھی رکھتی ہے، اور مختلف اقوام اس کے مختلف اعضا ہیں جو بہ لحاظ تعلقات ایک دوسرے سے بالکل پیوستہ ہیں۔ اس کا قلب زندہ ہے، مگر اس وقت افراد کے قلوب میں سو رہا ہے، اس لیے کہ ابھی ان میں عام محبت کا جذبہ نہیں پیدا ہوا ہے،

وقت آگیا ہے کہ اس زندہ جسم کا ایک غور و فکر کرنے والا دماغ بھی پیدا کیا جائے اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر قوم کے وہ افراد یکجا ہوں جو گویا انسانیت کے دماغ سے سوچتے رہتے ہیں آئندہ اقوام کی رہنمائی و سرداری انھیں کے ہاتھ میں ہوگی،

جب شہروں کی طاقتوں نے مجتمع ہو کر اقوام موجودہ کی تخلیق کر دی اور ان سے عجائب و غرائب کا ظہور ہونے لگا، تو جس وقت سارے عالم انسانی کی قوتیں۔ یکجا و متحد ہو جائیں گی، اس وقت معلوم نہیں کن کن معجزات کا ظہور ہونے لگے گا، اس وقت جبکہ انسانیت میں نظم پیدا ہو چکی ہوگی، جبکہ انسانیت خود اپنی قسمت کی مالک ہو چکی ہوگی، جب کہ وہ اپنی موجودہ ادنیٰ زندگی کی بندشوں سے آزاد ہو چکی ہوگی، اس وقت وہ "انسان جدید" کو پیدا کرے گی جس کی آمد کا فطرت کو انتظار ہے، اس وقت موجودہ پُرارمان خوابوں کی تعبیر نکلے گی۔

اے دیوانہ انسان! تو آج اپنا گوشت اپنے ہاتھوں نوچ رہا اپنے اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے، وقت آگیا ہے کہ تیرے امراض کو شفا ہو جائے، اور تیرا شعور و احساس بیدار ہو جائے،

اے اقوام! تم آج اس سے بے خبر ہو کہ ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہو تم آج ایک دوسرے کی خوں ریزی میں مصروف ہو، وقت آگیا ہے کہ تمھیں

اس باہمی مقاتلہ سے نجات ملے، اور تم میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ تم سب ایک روح اور ایک قالب ہو، اپنے میں انسانیت کا احساس بیدار کرو،

اور اے روح ربانی، تو اس وقت افراد و اقوام سب کے نفوس میں حالت خواب میں ہے، تیری بیداری کا وقت آ گیا! اب بیدار ہو، بیدار ہو،

تبصرہ

از

مؤلف

باب ۱

اُمن کا مفہوم

پیام امن کی منادی ایک فرینچ فلسفی کی زبان سے ہو چکی، لیکن چشم تصور دیکھ رہی ہے کہ بعض چہروں پر بجائے تسکین و اطمینان کے اب بھی شک و تذبذب کے آثار نمایاں ہیں، ممکن ہے، اس کا باعث تقریر کا اجمال اور صحبت کا اختصار ہو، اگر ایسا ہو تو صحبت کی عمر کچھ دیر کے لیے بڑھائی جا سکتی ہے؟ صفحات آیندہ میں اس کی کوشش کی جائے گی کہ جو گرہیں اب تک باقی رہ گئی ہیں انھیں بھی کھول دیا جائے۔

منطقی حیثیت سے اس بحث میں تنقیحات ذیل قائم ہوتی ہیں۔

۱۔ امن کی تعریف کیا ہے؟

۲۔ نقض امن کے کیا کیا محرکات و اسباب ہوتے ہیں؟

۳۔ حصول امن کی کوششیں اب تک کیوں ناکام رہیں؟

۴۔ کیا اب کسی طریقہ سے کامیابی ہو سکتی ہے؟

ابواب آیندہ ترتیباً انھیں سوالات کا جواب دیں گے، ان کے بعد

مسئلہ پر ایک مذہبی نظر ہوگی، رفع شکوک و توضیح مطالب کے لیے دیباچہ میں چند سطروں کی جگہ نکالی گئی ہے۔

امن کی تعریف، بہ پابندی قواعد منطق مرتب کرنا دشوار ہے۔ لیکن دشواری سے قطع نظر کر کے یہ کوشش لاحاصل بھی ہے، اس لیے کہ ذہن ان تصورات مجردہ کا مفہوم ان کی منطقی تعریفات کی بنا پر اخذ ہی نہیں کر سکتا، ایسی چیزوں کی شناخت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے اضداد ان کے سامنے لائے جائیں، تاکہ دونوں کی خصوصیات کے تضاد و تقابل سے ذہن از خود ایک مفہوم اخذ کرے۔

تاریکی کا اگر تجربہ نہ ہو تو روشنی کا لفظ بے معنی ہے، تندرستی کی شناخت اپنی ضد بیماری ہی کے باعث ہوتی ہے، بدصورتوں سے اگر واقفیت نہ ہو تو حُسن کا کوئی مفہوم ذہن میں نہ پیدا ہوگا، ٹھیک اسی طرح امن کا مفہوم صرف اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب بدامنی سے اس کا تقابل کیا جائے،

جنگ اپنے وسیع معنی میں بدامنی کے مرادف ہے جو مفہوم بدامنی کا ہے ٹھیک ٹھیک وہی معنی جنگ کے بھی ہیں، لیکن جنگ اپنے محدود معنی میں بدامنی کی ایک خاص صورت کا نام ہے۔ جنگ و بدامنی اصولاً دو جداگانہ و ممتاز چیزیں نہیں فرق صرف یہ ہے کہ عام بدامنی کسی اصول یا ضابطہ کے تحت نہیں ہوتی اور جنگ اپنے متعین قواعد و ضوابط رکھتی ہے، گویا بدامنی کی نسبتاً شایستہ صورت کا نام جنگ ہے

دیکھنا یہ ہے کہ حالت جنگ کے خصوصیات کیا ہوتے ہیں،

۱۔ جنگ کی سب سے پہلی اور بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ قوت فیصلہ زبان شمشیر کو حاصل ہو جاتی ہے، مناقشات کا فیصلہ حق و ناحق کی بنا پر نہیں بلکہ فریقین کی قوت و طاقت کی بنا پر ہوتا ہے، یا کم از کم یہ کہ کوشش اسی کی کی جاتی ہے،

۲۔ بہت سے اعمال جن کا ارتکاب عموماً اخلاقی حیثیت سے معاصی کے درجہ

میں رکھا جاتا ہے۔ حالت جنگ میں جائز ہو جاتے ہیں، خوں ریزی، تشدد، مکر، خیانت زناکاری یہ تمام اعمال جو عموماً ذمائم اخلاق کے انتہائی نمونہ سمجھے جاتے ہیں، حالت جنگ میں انکا ارتکاب فریق مخالف کے مقابلہ میں نہ صرف جائز بلکہ اکثر صورتوں میں واجب قرار پاجاتا ہے۔

۳۔ اتحاد و اشتراک جو حیات اجتماعی کے لیے بمنزلہ بنیاد کار ہے حالت جنگ میں بے اثر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ انتقام و مخالفت کی قوتیں لے لیتی ہیں، اتحاد و اشتراک ظاہر ہے کہ بالکل فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ حالت جنگ میں بھی ایک فریق کے مختلف اجزا، اپنے میں لازماً قائم رکھتے ہیں، لیکن اس اتحاد و اتفاق کا منشا صرف اس قدر ہوتا ہے، کہ فریق مخالف کی تخریب و بربادی میں زیادہ سہولت ہو،

ان کے علاوہ حالت جنگ کے اور بہت سے خصوصیات ہوتے ہیں مثلاً افراد عموماً جو اپنی تعلیمی، معاشری، اجتماعی و اخلاقی ترقی میں مصروف رہتے ہیں، یہ مشاغل اس وقت بالکل معطل ہو جاتے ہیں وقس علیٰ ہذا لیکن حالت جنگ کے اساسی مظاہر یہی تین ہوتے ہیں جو اوپر درج ہوئے، ان کے مقابلہ میں نمایاں خصائص امن حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فصلِ خصومات کی بنا قوت و طاقت نہیں بلکہ حق و استحقاق ہوتی ہے اور کوشش یہ رہتی ہے کہ قانون کا فیصلہ ناطق رہے جس کے سامنے اعلیٰ و ادنیٰ قوی و ضعیف، سب کو یکساں گردنِ اطاعت خم کر دینا پڑے۔

۲۔ ایسے افعال جن سے دوسروں کی جان و مال، عزت و ناموس کسی شے کی حق تلفی ہوتی ہو، جرائم سمجھے جاتے ہیں، اور ان کے لیے سخت سزائیں مقرر رہتی ہیں۔

۴- حیات اجتماعی کی ساری مشین کی گردش اتحاد و اشتراک کے محور پر ہوتی رہتی ہی، مدرسہ میونسپلٹی بینک، کارخانہ، تجارت گاہیں تماشہ گھر، ان میں سے ہر شے اپنے وجود کے لیے اس کی محتاج ہی کہ افراد باہم اتحاد و اشتراک کے لیے آمادہ ہوں،

امن و جنگ کے یہ فروق خارجی و ظاہری حیثیت سے تھے، لیکن ہر ایسی شے جس کا تعلق انسانی نفس و کردار سے ہی، اپنے کچھ داخلی و نفسی خصوصیات بھی رکھتی ہیں، اس حیثیت سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہی کہ حالت امن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہی کہ انسان اپنے نفس کو حالت سکون و اطمینان میں دیکھتا ہی، اسے دوسروں سے خواہ مخواہ بغض و عداوت نہیں ہوتی اور ہر شخص بہ اطمینان ان مشاغل میں مصروف رہتا ہی جن سے وہ اپنی فلاح وابستہ سمجھتا ہی، بہ خلاف اس کے حالت جنگ میں انسان اپنے تئیں ہنگامہ آرائیوں میں محصور پاتا ہی انتقام و برہمی کے جذبات اس کے دل میں مشتعل رہتے ہیں اور سکون قلب و طمانیت خاطر کا اپنے گرد نشان تک نہیں پاتا۔

گویا امن نام ہی اس حالت کا جس میں داخلی حیثیت سے انسان سکون خاطر محسوس کرتا ہی اور خارجی حیثیت سے جس میں قانون و آئین کی عملداری ہوتی ہی۔

امن کی اس تعریف سے ایک ضمنی مسئلہ یہ بھی واضح ہوجاتا ہی کہ عالمگیر امن ممکن العمل ہی، درآنحالیکہ عالمگیر جنگ سرے سے ممکن العمل ہی نہیں، ایسی حالت کے فرض کرنے میں کم از کم کوئی منطقی استحالہ یا تناقض نہیں لازم آتا، کہ بلا استثنا دنیا کا ہر شخص ایک دوسرے کی امداد و اعانت، شرکت و خدمت اپنا فرض سمجھنے لگے، اور اپنے ہر عمل میں دوسروں کی

ضروریات و آسائش کو اپنی ضروریات و آسائش پر مقدم رکھنے لگے، ایسی صورت فرض کرنے سے نظام عالم میں کوئی خلل تصور میں نہیں آتا، بخلاف اس کے جنگ کی پوری طور پر عالمگیری تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ خوب غور کرو کہ اگر ہر ہستیٔ بشری دوسری ہستیٔ بشری کی دشمن ہو جائے، اگر بھائی بھائی کو، باپ بیٹے کو، ماں بیٹی کو قتل کرنے لگے تو کائنات انسانی کی زندگی کتنی دیر کی مہمان رہ سکتی ہے، نظام کائنات کا قیام اور جنگ کی کامل عالمگیری یہ دونوں تصورات باہم متناقض ہیں،

آیندہ صفحات میں حصول امن کی تدابیر وغیرہ پر جو گفتگو ہوگی وہ سب امن کے اسی معنی کے لحاظ سے ہوگی، لیکن معترض کہہ سکتا ہے کہ امن کا وجود دنیا میں ہے کہاں ؟ جن ممالک میں جن زمانوں میں امن سمجھا جاتا ہے وہ بھی مصرحہ بالا معنی میں امن سے خالی نظر آتے ہیں، یعنی جو ممالک مشغول جنگ نہیں ہیں ان میں بھی صدہا کاروائیاں ہر وقت ایسی نظر آئیں گی جو امن کامل کے منافی ہیں حکام کا ظلم، رعایا کی شورش، آپس کی مخالفت ایک دوسرے کی مزاحمت ان چیزوں سے دنیا کا بہتر سے بہتر ملک بھی کب خالی ہے ؟ بس ایک وہمی خیالی شے کے حصول کی کوشش جو دنیا میں اب تک غیر موجود رہی ہے۔ کون سی دانشمندی ہے،

لیکن معترض نے اس پر غور نہیں کیا، کہ انسان جس کسی غایت یا مطمح کے حصول کے درپے رہتا ہے، ان میں سے کسی ایک تک بھی اس کی رسائی پوری طرح نہیں ہو سکتی، تاہم اس کے لیے سعی و کوشش اس کی فطرت میں داخل ہے، صحت جسمانی کے لیے کوئی کامل نمونہ آج انسانی آبادی میں موجود ہے ؟ بڑے سے بڑے تندرست شخص، بڑے سے بڑے طاقتور پہلوان کی صحت میں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے

کچھ نقص یقیناً پایا جاتا ہے، بایں ہمہ ہر شخص صحت کی تلاش میں رہتا ہو حُسن کامل دنیا کے بے عنقا ہی، حسین ترین ہستی بھی کوئی نہ کوئی عیب ضرور رکھتی ہو۔ تاہم حُسن کی تلاش کو کوئی شخص مہمل نہیں قرار دیتا، کامل نیکی کا بلاشائبہ بدی دنیا میں وجود ہر شخص محال تسلیم کرے گا، تاہم ہر شارع مذہب اور ہر حکیم اخلاق دنیا کو اسی کی دعوت دیتا ہو۔

غرض کسی مطمح (آیڈیل) کا بتمامہ انسانی دسترس میں نہ آنا اس کا باعث نہیں ہو سکتا کہ سرے سے اس کے حصول ہی کا خیال چھوڑ دیا جائے گا، بلکہ انسان کی اصلی کامیابی یہ ہو کہ اس ناقص دنیا میں اپنے ناقص قویٰ کی مدد سے جس حد تک بھی اس کا حصول کر سکے اس کی سعی میں مصروف رہے اور اس لحاظ سے تلاشِ امن اسی قدر معقول ضروری اور مقتضائے فطرت ہو جس طرح صحت کی فکر حسن کا ذوق، اور حسن عمل کی سعی،

باب (۲)

نقضِ امن کے اسباب

فلسفۂ فطرت کا یہ ایک عجیب قانون ہے کہ جو شے انسان کے لیے سب سے زیادہ موجبِ برکت و باعث فلاح ہوتی ہے، یا جو نفس بشری کے لیے سب سے زیادہ دلکشی و محبوبیت رکھتی ہے، عملاً اس کا حصول اسی قدر دشواریوں سے لبریز اور موانع و مشکلات سے پُر ہوتا ہے، صحت سے بڑھ کے انسان کسی شے کا حریص ہو سکتا ہے؟ لیکن کیا کوئی بڑے سے بڑا با احتیاط شخص بھی ایسا ہے، جو اصولِ حفظ صحت کی پوری پوری پابندی کرتا ہے؟ نیکی سے عزیز تر کون سا جادۂ سعادت انسان کے لیے ہو سکتا ہے؟ بایں ہمہ اس منزل کے کتنے راہرو ایسے ہیں جو باوجود ثبات عزم، قدم قدم پر ٹھوکریں نہیں کھاتے۔

امن و امان بھی اس قبیل سے دنیا کی ایک بزرگ ترین نعمت ہے، کیونکر ممکن تھا کہ اس کے راستہ میں پھولوں کا فرش ہوتا، یہی باعث ہے کہ جس وقت سے تاریخ کا وجود ہے کوئی زمانہ، کوئی دور، بہ طور امنِ کامل کے نمونہ کے نہیں پیش کیا جا سکتا، بس تین چار ہزار سال کی مدت میں جب سے کہ منضبط و مستند تاریخ انسانی

موجود ہی، چشم کائنات ترقی و تمدن کے بیسیوں دلفریب مناظر دیکھ چکی ہی، چین و ہندوستان، مصر و ایران، رومہ و یونان، عرب و یورپ، سب اپنی اپنی نوبت میں علوم و فنون کے مرکز، فلسفہ و حکمت کے سرچشمہ اور تہذیب و شائستگی کے نقیب رہ چکے ہیں لیکن اس میں سے ہر ایک کی تاریخ ایک داستان خونیں ہی، اور ہر قوم کی سرگزشت ایک مرقع جدال و قتال ہی، دریو دھن کی ستم آرائی، سکندر کی ملک گیری، دارا کی جاہ پرستی، نیرو کی بہیمیت، جولیس قیصر کی خون آشامی یزید کی شقاوت، چنگیز کی جہاں سوزی ہلاکو کی سفاکی اور موجودہ یورپ میں سلطنتوں کی حشر انگیزیاں، تاریخ عالم کے استثنائی واقعات نہیں، دفتر کائنات کا ایک ایک صفحہ نسل انسانی کے خون سے لالہ زار بنا ہوا ہی اور سطح ارض کا چپہ چپہ بے شمار نفوس انسانی کے قتل و ہلاکت کا تماشا گاہ ہی،

اس امن شکن صورت حال، اس قتل و خونریزی کے تسلسل کے اسباب، اگرچہ صدہا ہو سکتے ہیں، لیکن ہماری زبان میں ان سب کے لیے ایک جامع مقولہ "زر، زمین، زن" کا ہی، یعنی دنیا میں جتنے بھی مناقشات پیدا ہوتے رہتے ہیں سب کی تہ میں انھیں اسباب ثلاثہ میں سے کوئی نہ کوئی شے بنائے مخاصمت ہوتی ہی، اور تاریخ و تجربہ کی طرف رجوع کرنے سے اس مقولہ کی صحت و صداقت میں مطلق شبہ نہیں رہ جاتا۔

نفسی حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو اسباب نقض امن اور محرکات قتال بین الاقوام کی فہرست کے عنوانات جلی حسب ذیل نکلیں گے، جو تاریخ کے ہر دور اور روئے زمین کے ہر خطہ سے متعلق یکساں حاوی ہوں گے۔

۱۔ جذبۂ انتقام۔ ملکی جنگ وجدل کا ایک بڑا سبب اب تک قوموں کا جذبہ انتقام رہا ہی، ایک قوم جب اپنی جگہ پر یہ سمجھنے لگتی ہی، کہ دوسری قوم نے کسی

معاملہ میں اس کے ساتھ زیادتی یا اس کی حق تلفی کی ہو تو یہ خیال اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا بلکہ برابر انتقام کے لیے اکساتا رہتا ہو، یہاں تک کہ زمانہ کے انقلابات کبھی نہ کبھی اس کی مساعدت کر کے اس کے لیے اس جذبہ کی تسکین کے مواقع بہم پہنچا دیتے ہیں اور وہ ظالم قوم سے دل کھول کر بدلہ لے لیتی ہو، لیکن اب یہ دوسری قوم اپنے تئیں مظلوم سمجھنے لگتی ہو اور وہ اس سے انتقام لینے کی فکر میں لگی رہتی ہو، اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دور گزشتہ میں اموبہ، عباسیہ، فاطمیہ، قرامطہ، باطنیہ، ہر خاندان اور ہر فرقہ اپنے تئیں مظلوم اور اپنے حریف کو ظالم قرار دیتا رہا، حال کی عالمگیر جنگ میں جتنی حکومتوں نے حصہ لیا ان کے سرکاری بیانات پڑھو تو ہر حکومت یہی کہتی ہوئی سامنے آتی ہو کہ "جنگ کی ابتدا ہمارے فلاں حریف نے کی اور ہم نے تو محض دفاع مظالم کے لیے تلوار ہاتھ میں لی" جرمنی، آسٹریا، روس، انگلستان، فرانس، اٹلی، امریکہ سب کے بیانات کا خلاصہ اپنی مظلومیت و مجبوری اور اپنے حریفوں کی دراز دستیوں کی افسانہ خوانی ہی نکلتا ہی۔

پھر اگر انتقام لینے کی حالت میں بھی عدل ملحوظ رہی تو خونریزیوں کا سلسلہ نامتناہی نہیں ہو سکتا، لیکن ستم یہ ہو کہ ہر فریق غلبہ کے وقت عوض و معاوضہ کے جائز حدود سے متجاوز ہو کر فریق مغلوب پر طرح طرح کے شدائد نازل کرنا شروع کر دیتا ہو۔ اور اس طرح انتقام کا دورہ برابر قائم رہتا ہی، اور یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔

۲- خواہش ناموری، ہر زمانہ میں بعض سلاطین یا ارکان سلطنت یا سرداران فوج کے سروں میں یہ سودا سمایا رہتا ہی، کہ جس قدر ممالک مسخر کریں گے اسی قدر انھیں اپنے ہم عصروں میں ناموری اور صفحات تاریخ میں عظمت حاصل ہوگی، سکندر، جولیس سیزر، چنگیز، تیمور، ہنیبال، نپولین، بسمارک، کلائیو، ڈل ہوزی، کچنر، ہنڈنبرگ، برنہارڈی اسی طبقہ کے مشاہیر ہوئے ہیں۔ اور یہ حضرات اپنی خونریزی

یادگاریں چھوڑ گئے ہیں، انھیں انسانیت اپنی زندگی بھر نہیں فراموش کر سکتی اس قبیل کے اشخاص سے کوئی تاریخی دور بالکل خالی کبھی نہیں رہا۔ باہم مختلف ادوار میں اس لحاظ سے فرق مراتب رہا کیا ہے، اور جس زمانہ میں یہ خبط جتنا زیادہ شائع رہا ہے، وہی زمانہ اپنے نقوش انسانیت کی تاریخ میں خون کے حروف سے ثبت چھوڑ گیا ہے،

۳۔ توسیع مملکت قومی، ہر ملک میں ایسے سیاسی اشخاص کی کچھ تعداد بھی ہمیشہ موجود رہتی ہے جو قومیت کے خیال کو انسانیت کے خیال سے بالاتر رکھتے ہیں، اور جن کے ضابطۂ اخلاق میں قومی اغراض کے لیے کذب و ناراستی ڈپلومیسی یا مصالح ملکی کے نام سے بالکل جائز ہے، یہ لوگ اپنی قوم کی فلاح و ترقی اسی میں مضمر سمجھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی قومی حکومت کی حدود کی توسیع کرتے رہیں اور جس ذریعہ اور حیلہ سے بھی ہو سکے دوسری قوموں کو اپنی قوم کا غلام اور دوسرے ملکوں کو اپنے ملک کا محکوم بنایا جائے، اس وقت "قومیت" و "قوم پرستی" کے جس غلغلہ سے فضائے کائنات گونج رہی ہے اس نعرہ میں گرمجوشی اور اس آواز میں بلندی پیدا کرنے والا عنصر یہی ذوق ملک گیری ہے، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ جب دو قوموں کی قومیتیں باہم ٹکراتی ہیں تو اس تصادم کا آخری فیصلہ محض دست و بازو کے زور سے ہوتا ہے، انگلستان پر جو اس وقت قومیت کی دُھن سوار ہے اس میں اس کو مطلق نہیں نظر آتا کہ کتنی ضعیف و پست قومیں پامال ہوتی جاتی ہیں، جرمنی کو جب وطنیت کا نشہ تیز ہوا تو اسے بالکل نہ یاد رہا کہ اس دیوی کے آگے بے شمار نفوس انسانی کی بھینٹ چڑھانی پڑے گی۔

۴۔ ہوس زر، ہر قوم اپنے تئیں دولت و تموّل کا پورا حق دار سمجھتی ہے اور جب وہ دیکھتی ہے کہ دوسری قوم اس کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ باثروت و دولت مند

ہو، تو رشک و حسد کا جذبہ اس میں موجزن ہوتا ہو، پھر اگر اس قوم کو اپنی قوت پر اعتماد ہو تو ان جذبات پر عمل بھی شروع کر دیتی ہو، جاپان کے لیے اس کی برداشت ناممکن ہو کہ اس کی تجارتی دولت میں امریکہ شرکت کرے، علیٰ ہذا امریکہ اسے کسی حالت میں گوارا نہیں کر سکتا کہ جاپان اس کے زیر اثر بازاروں میں اپنا اثر قائم کرے، جرمنی، انگلستان، فرانس و اٹلی کی باہمی رقابتیں تمامتر اسی ہوس زر کا ثمرہ ہیں، یہ جذبہ اگرچہ ہمیشہ سے اقوام کے باہمی تعلقات میں قوی رہا ہو، لیکن دور جدید میں اس کی قوت بدرجہا بڑھ گئی ہو، موجودہ تمدن جو تجارتی تمدن ہو، بغیر تاجرانہ مسابقت اور دکانداراںہ رشک و حسد کے زندہ نہیں رہ سکتا، اور اسی کا نتیجہ ہو کہ اشیاء تجارت کی قیمتوں میں جتنی گرانی ہوتی جاتی ہو اسی تناسب سے انسانی زندگی کی قیمت ارزاں ہوتی جاتی ہو۔

۵۔ تعصب، ایک اور شے جو تاریخ عالم میں صدہا محاربات کا باعث بن چکی ہو اقوام کا تعصب مذہبی ہو، مذہب کی حقیقی تعلیمات کے بالکل برخلاف عموماً ہر مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیروؤں کو عداوت و نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو انھیں نیچا دکھا کر اپنے مذہب کا علم بلند کیا جائے گا گویا یہ بھی کسی مذہب کی صداقت کی ایک دلیل ہو سکتی ہو، کہ اس نے اپنے سے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو اتنی بڑی تعداد میں اور اس بیدردی کے ساتھ پامال کیا! بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہو کہ موجودہ تمدن نے اس جذبہ کو فنا کر دیا ہو، اور بظاہر اب مذہبی محاربات کا سلسلہ بند ہو گیا ہو لیکن در اصل یہ جذبہ فنا نہیں ہوا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شرارے اب زیر خاکستر رہنے لگے ہیں، لیکن اب بھی جب کبھی جذبات کی ہوا زور پکڑتی ہو، تو معاً یہ شعلے بلند ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں، اور یہ سچ ہو کہ دنیا میں

اب تک جتنی خونریزیاں تعلیمات مذہب کے غلط معنی لے کر اور نفس کی خواہشوں کا مذہب کا جامہ پہنا کر کی گئی ہیں اتنی شاید کسی دوسرے مؤثر کے ماتحت نہ ہوئی ہوں،

یہ وہ چند متعین اسباب ہیں جن میں سے ایک یا چند اب تک ہر نقض امن کے باعث و محرک ہوتے رہے ہیں، دنیا میں آج تک جتنی خونریزیاں اور جنگیں ہوئی ہیں، ان سب کی تہ میں ہمیشہ یہی اسباب کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے لیکن ان سب سے برتر، اہم تر ایک عام سبب خود موجودہ تمدن بھی ہے، اور جب تک موجودہ تمدن کا وجود قائم ہے سلسلہ جنگ کا قائم رہنا بھی ناگزیر ہے۔

یہ دعویٰ بظاہر حیرت انگیز معلوم ہوگا لیکن تھوڑے تامل کے بعد اس کی صداقت ازخود واضح ہو جائے گی، تمدن جدید کے جتنے عناصر ترکیبی ہیں، تحلیل کر کے دیکھو تو ان میں سے کوئی بھی عنصر ایسا نہ ملے گا، جو براہ راست یا بالواسطہ جنگ و جدل، حرب و ضرب کے نتیجہ تک پہنچانے میں معین نہ ہونا ہو، اس مادی تمدن کی ساری گرم بازاری صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارتی کاروبار کے پھیلاؤ پر ہے، لیکن یہ مقصد بغیر اس کے حاصل ہونا ممکن نہیں کہ مصنوعات ملکی کے لیے ملک سے باہر بازار اور منڈیاں ہوں؟ یہیں سے باہمی رقابت و کشمکش شروع ہوتی ہے، اور اس کا آخری فیصلہ توپوں کی گرج اور تلواروں کی جھنکار کرتی ہے، انگلستان و جرمنی کی عداوت کی اصلی بنیاد کیا تھی؟ محض تجارتی رقابت، امریکہ و جاپان کے تعلقات میں کیوں روز افزوں تلخی پیدا ہوتی جاتی ہے؟ صرف اس لیے کہ ایک دوسرے کو دکاندارانہ حیثیت سے اپنا حریف سمجھتا ہے،

سائنس کی ترقی، عجیب و غریب آلات کا اختراع اور جدید وسائل سفر کا

انکشافات تمدن جدید کے زریں کارنامے ہیں ان میں سے کون سی شے ایسی ہے جو گزشتہ ہولناک جنگ کو مہیب تر بنانے میں براہ راست معین نہیں ہوئی یا آیندہ کی دہشت انگیزیوں میں اضافہ نہیں کر رہی ہو؟

تکلفات کو لوازم حیات میں داخل کر لینا اور اخلاق کے نصاب درس سے قناعت و توکل کے ابواب کو مردود کر کے حرص و نفس پرستی کو بلند نظری و حوصلہ مندی کے نام سے معیار کمال اخلاقی قرار دینا اور دوسری طرف ضروریات زندگی کی ناقابل برداشت گرانی اور سامان معیشت کی نایابی، یہ حالات اگر بدامنی و خونریزی کا نہیں تو اور کس منزل کی طرف لے جانے والے ہیں؟

قیاس و استدلال سے قطع نظر کر کے خود تاریخ کا کیا فتویٰ ہے؟ ہندستان کے تمدن کا خاتمہ کس چیز نے کیا؟ یونانی تمدن کی زندگی کس شے نے ختم کی؟ رومی تمدن کو کس شے نے ہلاک کیا؟ سب کا مشترک جواب اغیار سے محاربات اور باہمی خانہ جنگیوں میں ملے گا، آج یورپ جس آلہ سے خودکشی کر رہا ہے وہ بجز جنگ و خونریزی کے اور کیا ہے؟ درآنحالیکہ جرمنی و انگلستان فرانس و امریکہ تمدن جدید کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔

باب (۳)

"اہل تدبیر کی واماندگیاں"

دنیا صدیوں سے مجروح ہوتی چلی آرہی ہے، لیکن پچھلے چند سال کی مسلسل و ہولناک خونریزیوں نے تو سطح ارض کو ایک مستقل میدان قتال کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے، نوبت یہ پہنچی ہے کہ قلب انسانی زخموں سے چور چور ہے، اور انسان انسان کے نام سے پناہ مانگنے لگا ہے، جو ممالک شریک جنگ و مصروف پیکار تھے ان میں بھی اندرونی شورشوں اور خانگی مناقشات کی کثرت نے امن و اطمینان کے وجود کو عنقا کر دیا ہے، ہر طبقہ دوسرے طبقہ ملک سے دست و گریبان ہے، اور ہڑتالوں اور مظاہروں کے تسلسل نے نظم و سکون کے شیرازہ کو سرے سے درہم برہم کر دیا ہے،

مغرب میں اس وقت "بہترین" دل و دماغ کے افراد موجود ہیں، ان کی قوت ایجاد و اجتہاد کا غلغلہ فضائے عالم میں بلند ہے، ان کے ایجاد کردہ وسایل سفر نے بعد مسافت کے لفظ کو بے معنی بنا دیا ہے، ان کے حیرت انگیز آلات خبر رسانی نے قرب و بعد کے امتیاز کو فنا کر دیا ہے، خواص مادہ و قوت کا کوئی راز ان سے

مخفی نہیں، قوانین فطرت و نوامیس طبعی ایک ایک کرکے اُن کے نوکِ زبان ہیں، اُن کا فنِ طبابت بقراط و جالینوس کے کمالات کو بازیچۂ اطفال بنا چکا ہو، ان کی بلند پروازی وسعتِ ارض کو اپنے لیے ناکافی پا کر آسمان پیمائی میں مصروف ہو گئی ہو، یہ سب کچھ ہو لیکن کیا دُنیا کو غسلِ خونیں سے نجات دینا ان دماغوں کی قوتِ استطاعت سے باہر ہے؟ کیا اب تک انھوں نے اس پر توجہ نہیں کی؟ یا توجہ کی اور ناکام رہی؟

ف۱ه اس سلسلہ میں راقم ہذا کے دو نوٹ جو رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں آغاز ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئے تھے، غالباً خالی از لطف نہ ہوں گے وہ حسبِ ذیل ہیں،

فرینچ اکاڈمی (پیرس) نے حال میں اعلان کیا ہے کہ جو شخص اس سال میں کسی دوسرے سیارہ کے باشندوں سے نامہ و پیام کا طریقہ دریافت کر دے، اسے ایک لاکھ فرینک (فرانس کا ایک سکہ) انعام ملے گا، اہلِ فرانس کی ہمت و فکر کی یہ بلند پروازی و آسمان پیمائی بے شبہ قابلِ داد ہے، لیکن اگر یہی رقم روئے زمین پر امن و سکون قائم رکھنے کی کوشش میں صرف کی جاتی تو تمام دنیا اور خود یورپ کے حق میں اس سے کہیں زائد مفید ہوتا،

. . . .

یورپ کی ہمت و قوتِ اختراع کے امتحان کا اصلی وقت وہ ہوگا جب کرۂ ارض اور اس نو دریافت سیارہ کے باشندوں کے درمیان سلسلۂ جنگ چھڑے گا اور آسمان و زمین کی درمیانی فضا عرصۂ تیغ اور خاک نشین فریقین کی آتش باریوں اور جہاں سوزیوں کی تماشا گاہ بنی ہوگی، حیرت اور حیرت سے زیادہ عبرت کا مقام ہے کہ جن دماغوں کی پرواز فکر کے لیے فضائے ارض ناکافی ہے اور جن کی بلند ہمتی کا جوش سقفِ فلک سے ٹکرا رہا ہے، وہ اتنی بات پر قادر نہیں کہ روئے زمین پر نہ سہی یورپ ہی میں، یورپ بھر میں نہ سہی، اس کی کسی ایک سلطنت میں، سلطنت بھر میں نہ سہی، اس کے کسی بڑے صوبہ میں امن و سکون کی حکومت قائم کر سکیں! گلستاں کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے، کیا اب تک محقق شیراز کا یہ مشہور شعر فرنچ اکاڈمی کے فاضل ارکان کی نظر سے نہیں گزرا ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی　　　که با آسمان نیز پرداختی

جو لوگ مغرب اور مغربی تمدن سے مرعوب ہیں، ان کے ذہن میں اس قسم کے سوالات کا حیرت و استعجاب کے ساتھ پیدا ہونا بالکل قدرتی ہے، لیکن جن اشخاص نے بغیر تعصب و مرعوبیت کے سچائی اور سنجیدگی کے ساتھ واقعات پر نظر رکھی ہو وہ جانتے ہیں کہ یورپ کا دماغ اہم و پیچیدہ مسائل کے سمجھنے میں کیسی شدید غلطیاں کرتا ہے، اس کا نظام معاشرت و تمدن کتنی کمزور بنیادوں پر قائم ہے، اور اس کے علوم و فنون کس کثرت سے مغالطات و مسامحات کے پردہ دار ہیں، آلات، کلوں اور برقی و دخانی کارخانوں نے دنیا کو جو ناقابل تلافی نقصانات پہنچائے ہیں، مغربی طب نے معمولی امراض کی تشخیص میں جو صریح غلطیاں کی ہیں، مادی نظام تعلیم نے جس طرح جرائم کی تعداد روز افزوں کر دی ہے، جدید آئین معاشرت نے جس طرح صحت کو برباد، اوسط عمر کو کم اور بداخلاقیوں میں اضافہ کیا ہے، اور تمدنی نفاستوں و نزاکتوں نے جس طرح قوائے انسانی کو مستقلاً ضعیف کر دیا ہے، ان چیزوں کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا، اس عام صورت حال سے قطع نظر کر کے مخصوص اس مسئلہ سے متعلق یورپ اس وقت تک کافی کوششیں کر چکا ہے، خوں ریزی و بدامنی ایسی شے نہیں جو خوشی سے گوارا ہو سکے، یورپ جو مدت سے اس بلا کا ہدف بنا ہوا ہے اب تک بیسوں تدابیر اس کے انسداد کی کر چکا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ کُل علاج اب تک ناکام رہی ہیں، ان میں سے بعض اہم تدابیر کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱- یورپ کو جنگ کے مقابلہ میں سب سے بڑی سپر تجارت اور صنعت و حرفت کی معلوم ہوئی۔ خیال یہ تھا کہ بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں اور کارخانے قائم کرنے سے اتنی فرصت کس کو ملے گی جو حرب و ضرب کا خیال بھی کر سکے، گویا حُبِ زر کی قوت حُبِ حکومت کو توڑ دے گی، اور زر پرستی کے سامنے حکومت پسندی کا نشہ ہرن ہو جائے

گا، ہر ملک تجارتی و اقتصادی حیثیت سے دوسرے سے بالکل وابستہ و پیوستہ ہو جائے گا اور ان تعلقات کو توڑنا گویا اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاک کرنا ہوگا، پس اس خوف سے خود بخود امن کی حکومت عالم گیر ہو جائے گی۔

علاج کے بظاہر دلپذیر ہونے میں شک نہیں لیکن کارکنانِ فطرت نے اس وہم کو یوں باطل ثابت کیا کہ تجارت کو بجائے مانعِ جنگ ہونے کے ایک خاص محرکِ جنگ بنادیا! ہر قوم کی نظر اس پر ہمتی ہے، کہ دنیا کے بہترین بندرگاہ اس کے قبضہ میں ہیں تاکہ ساری دنیا کی تجارت اُس کی مٹھی میں رہے، اور جہاں اس مقصد میں کشاکش ہوئی وہیں جنگ شروع ہو جاتی ہے، گزشتہ جہاں سوز جنگ کی اس قدر طوالت کا باعث محض انگلستان اور جرمنی کی شرکت ہوئی، لیکن ان دونوں کی شرکت کی اصلی علت محض اُن کی باہمی تجارتی رقابت تھی، کسی زمانہ میں بیشتر محاربات دوسرے مقاصد کے لیے ہوتے تھے، لیکن اب تو ۸۰ بلکہ ۹۰ فی صدی جنگوں کی اصلی علت یہی تجارتی رقابت ہوتی ہے، بہ قول اکبر ؎

مذہب کے واسطے نہ شرافت کے واسطے
ہے اب تو جنگ صرف تجارت کے واسطے

۲۔ وبائے جنگ کا ایک دوسرا علاج جمہوریت سوچا گیا، اہل یورپ نے اپنے استقصا سے پایا کہ زمانہ قدیم میں جنگیں عموماً سلاطین و امراء سلطنت ہی کی جاہ پرستیوں کے نتائج ہوتی تھیں، اور رعایا کی جانیں خواہ مخواہ ان کی جاہ پرستیوں پر قربان ہو جاتی تھیں، پس اگر نظامات حکومت بدل دیے جائیں، یعنی بجائے سلاطین و وزراء کے عنانِ اختیار "جمہور" یا "قوم" کے ہاتھ میں آجائے تو جنگ کا وجود دنیا سے رخصت ہو جائے اس لیے کہ قومیں آپس میں رشتہ مواخاۃ رکھتی ہیں اور ان میں باہم حسد و رقابت پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں!

یہ خیال، اگرچہ تاریخی شہادتوں کے قطعاً برخلاف تھا، تاہم اس نسخہ کی بھی نظر فریبی میں شبہ نہ تھا، لیکن تازہ تجربات نے آنکھوں سے دکھادیا، کہ جنگ جوئی، خون آشامی خود غرضی و دیگر جذبات رذیلہ میں "قوم" و "جمہور" افراد سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں، بلکہ چند قدم آگے ہی ہے، پچھلی عالمگیر جنگ کے لیے کروروں روپیہ کی منظوری اور وہ بھی ایک بار نہیں، متعدد بار کس نے دی؟ انگلستان کی "پارلیمنٹ" نے فرانس کے "چیمبر آف ڈپوٹیز" نے جرمنی کے "ڈائٹ" نے اور امریکہ کے "سینیٹ" نے یہ آوازیں اگر "قوم" و "جمہور" کی نہ تھیں، تو پھر کن چیزوں پر قوم کی آواز کا اطلاق ہوگا!

سنہ ۱۹۰۰ء میں جنگ ٹرانسوال کے موقع پر مشہور رئیس صحافت مسٹر اسٹیڈ نے جنگ کی مخالفت کی، لیکن انگریزی قوم نے ان کا ناطقہ بند کردیا، حال کی عالمگیر جنگ کی مخالفت لارڈ مارلے جیسی زبردست شخصیت کے مدبر نے کرنا چاہی، لیکن قوم کی برہمی نے ان کی زبان پر مہر لگادی اور نامور فلسفی مسٹر برٹرینڈ رسل نے ہمت کرکے زبان کھولی، تو قوم نے ان کے دلائل کا جواب سلاسلِ زنداں سے دیا، امریکہ میں پریسیڈنٹ ولسن نے شروع شرکت جنگ سے بے انتہا گریز کیا، قوم کی متفقہ آواز کے سامنے بالآخر انھیں گردن ڈال دینا پڑی، انگلستان فرانس، جرمن، امریکہ، ہر ملک میں مقبولیت و ہر دل عزیزی کے حصول کا راز صرف اس قدر تھا کہ جنگ کی پرزور تائید کی جائے، جن مدبرین کو ووٹ زیادہ حاصل کرنے ہوتے تھے، ان کے پاس اس سے زیادہ چلتا ہوا اور کوئی افسوں نہ تھا کہ جنگ کی حمایت میں پُرجوش تقریریں کردیں۔

جو اخبارات جنگ کی مخالفت کرتے تھے معاً ان کی اشاعت گھٹ جاتی تھی، جو افراد صلح و آشتی کے فضائل پر تقریر کرنا چاہتے تھے، اُن کی زبانیں دلائل کے زور سے نہیں بلکہ قوتِ بہیمی کے زور سے بند کردی جاتی تھیں، چنانچہ فرقہ

صلح جو کی مجلسوں میں بارہا اینٹ اور پتھر پھینکے گئے، یہاں تک کہ اس فرقہ کے لیے اپنے جلسوں کا انعقاد ناممکن ہو گیا، سوشلسٹ گروہ (اشتراکیہ) کی تعلیمات سے پوری توقع تھی کہ وہ قتل و خونریزی کی مخالفت کرے گا، لیکن آنکھوں نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ہر ملک کا سوشلسٹ گروہ اپنی اپنی سلطنت کی فوجی طاقت سے متحد ہو کر بہ کمال بلند آہنگی موت و ہلاکت کے شکاری کتوں کو میدان جنگ میں للکار رہا ہو۔

غرض ان مبہم مشاہدات و تجربات نے بڑے سے بڑے غفلت شعاروں کی آنکھیں بھی اس حقیقت کی جانب کھول دیں کہ امن و صلح کا ضامن "قومیت" و "جمہوریت" کو سمجھنا پانی کی بنیادوں پر اینٹ اور پتھر کی عمارت تیار کرنا ہو۔

۳۔ اُنیسویں صدی کے خاتمہ کے قریب خوش دماغان یورپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر تصفیہ نزاعات و فصل خصومات کے لیے ایک باضابطہ مرکزی عدالت قائم کر دی جائے جو مختلف سلطنتوں کے باہمی مناقشات کا فیصلہ کر دیا کرے تو جدال و قتال کی قطعاً کوئی ضرورت نہ باقی رہ جائے گی اور یورپ امن کی برکتوں سے بے خوف و خطر بہرہ اندوز ہونے لگے گا، چنانچہ نامور سلاطین اور مشاہیر مدبرین نے اس تجویز پر ہر طرف سے لبیک کہا یہاں تک کہ ہیگ (ہالینڈ) کو ایک مستقل مجلس مصالحت کا مستقر بنایا گیا، اور سیاسی کاہنوں نے جنگ کے خاتمہ کی وثوق و تیقن کے ساتھ پیش گوئی کر دی۔

تخیل یہ بھی بجائے خود دلکش تھا، لیکن ابھی ایک طرف مسرت کے شادیانے شروع ہی ہو رہے تھے کہ ساتھ ہی دوسری طرف افریقہ میں طبل جنگ پر چوب پڑی! جنگ سوڈان! — جنگ ٹرانسوال، جنگ روس و جاپان، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے مشرق سے لے کر مغرب تک ایک آگ لگ گئی اور زمانہ کی نیرنگی دیکھو کہ اس نہ بجھنے والی آگ کو جس دست شاہی نے سب سے پہلے

دیا سلائی سے مشتعل کیا وہ وہی تھا جس نے ہیگ کی صلح کانفرنس کا سنگ بنیاد رکھا تھا، یعنی شہنشاہ آسٹریا! آگ لگی اور اس قیامت کی لگی، کہ ہیگ میں مفاہمت و مصالحت کے پانی کا جو ذخیرہ فراہم کیا گیا تھا۔ اس کے دھارے ایک شعلہ کو بھی نہ بجھا سکے! ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس،

لیکن عاقبت اندیش! یورپ کے لیے شاید یہ تجربہ بھی بے اثر رہا ہے کہ اب اسی تجویز کو ایک دوسرے قالب میں، لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) کے نام سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے، اور اس بنیاد کے سہارے پر آیندہ صلح و امن کی سربفلک عمارت کا نقشہ تیار کیا جا رہا ہے،

۴- یورپ کو بہت بڑا اعتماد سائنس کی قوت پر تھا، امید یہ تھی کہ سائنس کی روز افزوں ترقی جنگ و جدال کو بالآخر محال بنا دے گی، یہ امید عوام الناس ہی کی نہ تھی، بلکہ اس میں حکماء و علماء بھی شریک تھے، اور اس نتیجہ کے ظہور پذیر ہونے پر دلائل و براہین قائم کرتے تھے، چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک روسی پروفیسر نے مخصوص اسی مبحث پر ایک تصنیف شائع کی، جس میں دلائل ریاضی سے یہ ثابت کیا کہ موجودہ آلات حرب کے ساتھ اگر دو فوجیں مساوی تعداد میں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوں، تو یہ صف آرائی قطعاً بے سود رہے گی، اس لیے کہ جب تک ایک فوج کی تعداد دوسرے سے سہ چند نہ ہو، اس کے لیے اپنے حریف پر حملہ کرنا حسب اصول و قواعد ریاضی محال ہوگا، اور چونکہ اس فریق کا دوسرے کے مقابلہ میں یہ تناسب رکھنا مستبعد ہے۔ اس لیے لامحالہ جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا!

پروفیسر صاحب کی ذہانت کی داد معلم فطرت نے یہ دی، کہ ابھی ان کی تحریر کی روشنائی بھی نہیں خشک ہونے پائی تھی، کہ خود انہیں کے ملک اور جاپان کے درمیان آویزش شروع ہوگئی اور فاضل مصنف کی آنکھوں کے سامنے ان کے

دوست و دشمن لاکھوں کی تعداد میں کام آئے۔ سنی میں سلطان اجل کے بے پناہ حملوں سے بسمل ہو ہو کر گرنے لگے۔ اور یہ مسئلہ غیر متحقق رہ گیا کہ موت کے فرشتے نے اپنی کارفرمائی میں پروفیسر موصوف کے ثابت کردہ اصول و قواعد ریاضی کی کس حد تک پیروی کرنا ضروری سمجھا۔

۵۔ اسی کے چند سال بعد دسمبر سنہ ۱۹۰۹ء میں انگلستان کے ایک عالی دماغ نارمن اینجل نے (گریٹ الیوژن) "وہم عظیم" کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب شائع کی ہے جس نے یورپ کے علمی و سیاسی حلقوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی، خلاصہ مباحث یہ تھا کہ جنگ سے مفتوح کو تو نقصان پہنچتا ہی ہے خود فاتح بھی اقتصادی و معاشی حیثیت سے سرتاسر خسارہ میں رہتا ہے اور چونکہ عموماً جنگ کی محرک یہی ہوس زر ہوتی ہے، پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ جنگ بجائے مفید ہونے کے فاتح کے حق میں الٹی مضر ہی پڑتی ہو، تو کوئی دانش مند خونریزی کا خیال بھی نہ کرے گا۔

کتاب جس قابلیت سے لکھی گئی تھی، اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہے، دعوے کے ثبوت میں بہ کثرت تاریخی شواہد پیش کیے گئے تھے، نتائج کی طرف ایک ایک قدم اصول اقتصادیات کی روشنی میں اٹھایا گیا تھا، استدلال میں کہیں سے خامی نہ تھی، ساتھ ہی کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چار برس کے عرصہ میں کتاب کے چودہ ایڈیشن شائع ہوئے! فرنچ، جرمن، روسی، جاپانی، ہسپانی متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے، انگلستان سے زائد دوسرے متمدن ممالک میں کتاب کی مانگ ہوئی، اور ہر مغربی ملک کے اخبارات و رسائل میں مدتوں اس پر ریویو کا سلسلہ جاری رہا۔

جنگ کے خاتمہ میں اب شک و شبہ کی کیا گنجائش رہ سکتی تھی لیکن جنگ طرابلس جنگ بلقان اور پھر جنگ جہاں سوز، یہ سب واقعات اشاعت کتاب

مذکور کے بعد کے ہیں، دولت کی ہوس اقوام پر جیسے پہلے مسلط تھی اب بھی ہے اس کے بہ جبر حاصل کرنے کا جو خبط بیشتر تھا، آج بھی جوں کا توں ہے اور بجام بیچاسے جو بُعد ہمیشہ تھا اس میں اب تک کوئی کمی نہیں۔

۶۔ گزشتہ جنگ کی ابتدا میں بعض ارباب قلم نے جو علی العموم صلح و آشتی کی حمایت میں رہا کرتے تھے، مگر اس وقت قتل وخوں ریزی کی تائید کر رہے تھے اپنی برئیت میں بار بار یہ عذر پیش کیا کہ "ہم لوگ محض اس اعتماد پر حربیت کی تائید کر رہے ہیں کہ کشت وخون کے مہیب و ہولناک مناظر دیکھتے دیکھتے خود فطرت بشری کشت وخون سے تنگ آجائے گی اور اسی طرح یہ جنگ سلسلۂ محاربات کی خاتم ہوگی"

یہ فلسفہ نظری حیثیت سے جو کچھ بھی وقعت رکھتا ہو، عملی حیثیت سے بھی یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ سالہا سال کی قیامت خیز خونریزیوں کے بعد ان مشاغل سے اُکتانا کیسا طبیعت اور زیادہ ادھر مائل ہوتی جا رہی ہے، روس کے وسیع رقبہ میں پولینڈ سے لے کر ترکستان تک اس درمیان میں ایک دن بھی ایسا گزرا ہے کہ تلواریں نیام کے اندر رہی ہوں؟ انگلستان اور افغانستان کے تعلقات اس اثنا میں کسی دن دوستانہ و مخلصانہ رہے ہیں؟ ترکی و یونان کے حدود کے درمیان اس عرصہ میں کس قدر خون کی ندیاں بہیں؟ تخفیف اسلحہ والی کانفرنس میں انگلستان، فرانس، امریکہ، جاپان کے تیور آیندہ کس زندہ طرز عمل کی غمازی کر رہے ہیں؟ انگلستان، امریکہ، جاپان و ذیلی "فاتحین" میں سے کون سا ملک ایسا ہے جس کی طبیعت جنگ و جدل سے سیر ہو گئی ہے؟ جرمنی، آسٹریا، ترکی "مفتوحین" میں کس نے آیندہ خوں ریزی سے محترز رہنے کا عہد کیا ہے؟ آئرلینڈ، مصر، ہندوستان، افغانستان، عرب،

راق، شام دنیا کی کون سی قوم ایسی ہو، جس کی پیشانی پر بل نہیں، یا جس کا
تھ تلوار کے قبضہ اور پستول کی بلبلی پر نہیں؟

غرض اس طرح یورپ نے امن عالم کی عمارت جن جن ستونوں پر
ائم کرنا چاہی، وہ سب ایک ایک کرکے پیوند زمین ہو چکے ہیں۔

باب (۴)

نسخۂ شفا

"دنیا عالم اسباب ہو" اس پر ہر مذہب، ہر جماعت اور ہر قوم کا اتفاق ہ
لیکن انسانی محرومیوں اور ناکامیوں کا سبب وجہ صرف یہ ہوتا ہو، کہ یا تو اسبا
تک اس کی نظر نہیں پہنچتی، یا اگر پہنچتی ہو تو ان اسباب کی فراہمی اس کے امکا
سے باہر ہوتی ہو، موت، بیماری، اور دنیا کے تمام دیگر ناگوار واقعات کا
انسان کو محض اس لیے غنا پڑتا ہو کہ ان کے وغیرہ کے اسباب کی بہم رسانی اس کے
ہاتھ میں نہیں ہوتی،

جن چیزوں کو عرف عام میں ناممکن کہا جاتا ہو ان کے معنی بھی صرف اس قدر
ہیں، کہ ان کے اسباب کی آفرینش انسان کے اختیار میں نہیں، انسان پانی کیوں
نہیں برسا سکتا؟ اس لیے کہ اسباب نزول باراں اس کے ہاتھ میں نہیں، اجرام
کی حرکت کو ہم اپنے ارادہ کا تابع کیوں نہیں بنا لیتے؟ اس لیے کہ ان کی حرکت
کے قوانین تک ہماری رسائی نہیں، انسان موت سے بچنا کیوں ناممکن سمجھتا
اس لیے کہ حیاتِ دوام کے اسباب اس کی دسترس سے باہر ہیں،

یہ صحیح ہے کہ کسی شے کی آخری علت جو بجائے خود غیر معلول ہو اب تک ذہن
انسانی نہیں دریافت کر سکا ہو، تاہم اضافی حقیقت سے جس قدر بھی سلسلہ علت و
معلول کی گہرائیوں میں ہم اتر سکتے ہیں اسی مناسبت سے یقینی و خاطر خواہ نتائج
حاصل کرتے رہتے ہیں، استاد اگر تلامذہ کی دلکشی کے عناصر کو سمجھ گیا ہو تو درس کو
یقیناً دلچسپ بنا سکے گا، طبیب نے اگر مرض کے اسباب کو سمجھ لیا تو علاج کی نفع
بخشی یقینی ہو، نیک چلنی کے محرکات جس حد تک ہمارے علم اور ہمارے اختیار میں
آتے جاتے ہیں اسی قدر نیک چلن بننا ہمارے لیے آسان ہوتا جاتا ہی۔

اس بنا پر مسئلہ قیام امن کا صحیح حل اس امر پر ٹھہرتا ہی کہ سب سے پہلے امن و
صلح کی اصل علت کا پتہ لگایا جائے، پھر اگر اس کا حصول سعی انسانی سے ممکن ہو
تو اسے پیدا کیا جائے اور نقض امن کی علت کو دور کیا جائے، گزشتہ باب میں ہم
دیکھ چکے ہیں کہ اہل مغرب نے اب تک متعدد تدابیر قیام امن کے لیے اختیار کیے
لیکن یہ تیر ایک مرتبہ بھی نشانۂ مقصد تک نہ پہنچ سکے، طبیب کا ذہن اگر اسبابِ
مرض تک نہیں پہنچا ہے تو قیامت تک اس کا علاج ناکام رہے گا۔

لیکن کسی واقعہ کی علت دریافت کیونکر ہو سکتی ہی؟ معلول سے علت تک
پہنچنے کی بحث منطق استقراء کا ایک مسئلہ ہے، اور حکمائے مغرب نے استقراء صحیح کے
متعدد طریقہ منضبط کئے ہیں، مل نے جو مغرب میں منطق استقراء کا بانی اور امام
مانا جاتا ہو اس نے اس موضوع پر بہت تفصیل سے لکھا ہی، اور اس کے بعد
کے علمائے منطق اسی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، ان طرق استقراء میں سے بعض کی
ضروری تصریح بیان کی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ آسان اور روزانہ زندگی میں کام آنے والا طریقہ استقراء وہ ہی
جسے طریق طرد (METHOD OF AGREEMENT) کہتے ہیں اور جسے مختصراً

ان الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں، کہ جب واقعۂ زیر تحقیق کی چند مثالوں میں ایک ہی جزو مشترک ہو تو یہ جزئیہ ان واقعات وحوادث کا یا سبب ہوگا یا نتیجہ۔ یا پھر رابطۂ علت، ہم نے یہ مشاہدہ کیا کہ

۱- الف ب ت سے خ وہ پیدا ہوئے

۲- الف ب ج سے خ دک پیدا ہوئے

۳- الف ح ک سے خ ن ف پیدا ہوئے

۴- الف ل م سے خ ق گ پیدا ہوئے

اس مثال میں ہمیں واقعہ خ کی علت دریافت کرنا ہے، ہم نے متعدد مثالوں میں مشاہدہ کیا کہ جب جب خ کا وجود ہوا ہے تو اس کے مقدمات میں الف ضرور موجود رہا ہی، باقی اور مقدمات برابر بدلتے رہے، لیکن ان کی تبدیلی کا خ پر کوئی اثر نہیں پڑا، اس سے معلوم ہوا کہ خ کی علت الف ہی، اس کی ایک واضح مادی مثال یہ ہو سکتی ہے،

فلاں روز میں نے چائے پی تھی، اس روز خنکی تھی، بارش ہو رہی تھی، میں دن بھر گھر کے اندر پڑا رہا تھا، شب میں نیند کم آئی تھی۔

۲- ایک ہفتہ ہوا پھر میں نے چائے پی تھی، اس روز خنکی نہ تھی، دن بھر اپنا معمولی کام کرتا رہا، شام کو ہوا خوری کے لیے بھی گیا تھا، شب میں نیند کم آئی تھی،

۳- پرسوں بھی میں نے چا پی تھی، اس روز دعوت میں غذائیں بھی ثقیل کھائی تھیں، سارا دن احباب کے ساتھ لطف و تفریح میں گم تھا، مگر شب میں نیند کم آئی تھی،

۴- آج بھی میں نے چائے پی تھی، آج غذا بہت ہی ہلکی ہوئی دن میں خوب

محنت بھی کرنا پڑی، آج شب کو بھی نیند کم آرہی ہی۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ جب جب نیند کم آئی ہی، تو گو اور مقدمات حالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہی، تاہم چائے پینے کا جزئیہ ہر حالت میں مشترک رہا ہی اس سے معلوم ہوا کہ نیند کم آنے کی علت چائے نوشی ہی،

دوسرے طریقہ کا اصطلاحی نام طریق عکس METHOD OF DIFF''SONCE ہی اس کا خلاصہ یہ ہی کہ اگر ایک مثال میں ایک واقعہ موجود ہو اور دوسری مثال میں موجود نہ ہو اور ان دونوں مثالوں میں کل عوارض مشترک ہوں بجز ایک کے جو پہلی میں موجود ہی اور دوسری میں نہیں، تو وہی عارض واقعہ مذکور کی علت ہوگا یا معلول اور یا رابطہ علت، فرض کرو ہم نے یہ مشاہدہ کیا، کہ

۱۔ الف ب ت ث سے ع غ ف ق پیدا ہوئے

۲۔ الف ج د ھ سے ع ل م پیدا ہوئے

۳۔ ب ت ث سے غ ف ق پیدا ہوئے

۴۔ ج د ھ سے ل م پیدا ہوئے

اس مثال میں، ہمیں واقعہ ع کی علت دریافت کرنا ہے ہم نے دیکھا کہ جن مثالوں میں ع واقع ہوا ہی ان کے مقدمات میں الف موجود ہی، اور جن میں وہ نہیں واقع ہوا ان میں صرف الف ہی غیر موجود ہی، اس سے صاف معلوم ہوا کہ ع کی علت الف ہی، کہ اس کا وجود ع کے وجود کو اور اس کا عدم ع کے عدم کو مستلزم ہی۔

ہم روز دوپہر کو سوتے تھے اور مسلسل ایک گھنٹہ تک سوتے رہتے تھے آج جب سونے کے لیے لیٹے تو دس ہی منٹ کے بعد کمرہ میں زور کا دھماکہ ہوا اور معاً ہماری آنکھ کھل گئی آج ہماری صحت ویسی ہی جیسی ہمیشہ رہتی تھی

کمرہ وہی ہے جس میں روز سوتے تھے، غرض تمام حالات وہی ہیں کوئی نئی بات نہیں پیش آئی، بجز اس کے کہ آج کمرہ میں ایک دھماکہ ہوا پس معلوم ہوا کہ معمول عام کے خلاف آج اتنی جلد ہماری آنکھ کھل جانے کا سبب یہی جدید واقعہ ہوا۔

منطقیین مغرب کے نزدیک یہ طریقہ استقراء سب سے زیادہ قطعی و یقینی ہے، اور اس سے کام لینے کے بعد علت کی تعین و تشخیص میں شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

ایک اور طریقہ استقراء کو طریق اختلاف الوصف - METHOD OF CONCONNTENT (VANAS ION) کہتے ہیں، اس کا ماحصل یہ ہے کہ جب ایک واقعہ ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا واقعہ بھی موجود ہوا لیکن جب پہلے واقعہ میں کچھ تغیر ہوا تو اسی مناسبت سے دوسرے واقعہ میں بھی تغیر ہوا تو ہر دو واقعات باہم علت و معلول ہوں گے یا کسی اور رابطہ علت سے باہم مربوط ہوں گے۔

جس زمانہ میں ملک میں غلہ ارزاں ہو جاتا ہے، جرائم میں کمی ہو جاتی ہے اور جس زمانہ میں گرانی ہوتی ہے جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے، اور اس مشاہدہ سے نتیجہ یہ نکلا کہ کثرتِ جرائم کی علت غلہ کی گرانی ہے، مقیاس الحرارت کو ہم گرم و سرد و مختلف مقامات میں لے گئے اور یہ مشاہدہ کیا کہ جو مقام جتنا زیادہ گرم ہے اسی قدر پارہ بھی چڑھتا ہے اس سے نتیجہ نکلا کہ پارہ چڑھنے کی علت گرمی ہے۔

ان کے علاوہ استقراء کے اور بھی قوانین ہیں مثلاً طریق طرد بالتکرار و طریق طرح لیکن ہمارے موضوع کے لیے صرف اسی قدر کافی ہے۔

ان قوانین سے ہمیں علت کی تفتیش و تحقیق کے طریقے معلوم ہوئے،

اب ان اصول کو مسئلہ قیام امن پر منطبق کر کے دیکھنا چاہیے کہ حالت امن و صلح کے مقدمات کیا کیا ہوتے ہیں، یہاں سے تجربہ و مشاہدہ کے حدود شروع ہوتے ہیں، اس سوال کا جواب دنیا تجربہ و مشاہدہ کا کام ہے، کہ ہماری صلح و محبت اور ہمارا اتحاد و خلوص کن کن اشخاص کے ساتھ اور کن کن حالات میں قائم رہتا ہے۔

اپنا سب سے بڑا دوست ہم خود اپنے آپ کو پاتے ہیں، انسان ساری دنیا سے لڑ سکتا ہے لیکن خود اپنی ذات سے کبھی نہیں لڑتا یہ برابر ہوتا رہتا ہے کہ ایک فرد ایک جماعت سے لڑ جائے، ایک کمزور انسان ایک پہلوان سے مقابلہ کر بیٹھے لیکن اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی کہ بڑے سے بڑا جنگجو و امن شکن شخص کبھی خود اپنی مخالفت پر آمادہ ہو گیا ہو، زبان میں بے شبہ اسی قسم کے فقرہ مستعمل ہوتے ہیں کہ "فلاں شخص اپنا دشمن ہے" یا "فلاں شخص اپنے دم سے بیزار ہے" لیکن ایسے مواقع پر مفہوم ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے دو نفس یا دو شخصیتیں ہیں، ایک نفس اعلیٰ دوسرا نفس ادنیٰ ایک نفس ملکوتی دوسرا نفس بہیمی اور تناقض و اختلاف ان دونوں کے درمیان ہے، یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک ہی نفس خود اپنے سے آمادہ جنگ ہو جائے۔

بدامنی، مخالفت و نقیض کے جتنے مظاہر ہیں سب اسی کلیہ کے تحت میں آجاتے ہیں، حسد ہم دوسروں کی ترقی پر کرتے ہیں، خود اپنے اوپر کبھی نہیں کرتے بدگوئی ہم دوسروں کی کرتے ہیں، خود اپنی کبھی نہیں کرتے غصہ ہم اوروں پر کرتے ہیں، اپنے اوپر کبھی نہیں کرتے وقس علیٰ ہذا، (جب کبھی ہم اپنے اوپر غصہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، تو مدعا ہمیشہ وہی ہوتا ہے کہ ہمارا ایک نفس ہمارے دوسرے نفس پر غصہ کر رہا ہے)۔

۲- اپنی ذات کے بعد لطف و خلوص ہمیں اپنی اولاد اور اس سے اُتر کر پھر اپنے اعزہ اور اپنے احباب کے ساتھ ہوتا ہے، ساری دنیا کی ترقی پر ہم رشک کرتے ہیں، لیکن اپنی اولاد کی ترقی مراتب پر، بجائے رشک و حسد کے ہمیں مسرت ہوتی ہے، دوسروں کی اولاد کو ہم بے ادب، بدتمیز و بدسلیقہ بناتے ہیں، لیکن جب بالکل اسی قسم کے حرکات ہماری اولاد سے سرزد ہوتی ہیں، تو ہم انھیں بچپن کی ذہانت و شوخی پر محمول کرتے ہیں، اپنی اولاد کی تکلیف کو ہم اپنی تکلیف سمجھتے ہیں اور ان کی راحت گویا عین ہماری راحت ہوتی ہے۔ مکر و فریب ہم دوسروں کے ساتھ برابر کرتے رہتے ہیں لیکن اپنی اولاد، اعزہ و احباب کے ساتھ شاذ و نادر ہی کرتے ہیں، اور کرتے بھی ہیں تو صرف اس وقت جبکہ ان تعلقات میں بجائے یگانگت کے مغایرت آگئی ہوتی ہے، اور وہ لوگ بجائے "اپنے" کے "پرائے" ہو چکتے ہیں۔

اعزہ کے سلسلہ میں یہ بھی مشاہدہ میں آتا رہتا ہے کہ جو عزیز ہمیں اپنی ذات سے زیادہ "قریب" معلوم ہوتا ہے، اسی قدر اس سے محبت و یگانگت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ داماد پہلے غیر ہوتا ہے لیکن "خویش" ہو جاتا ہے تو کس قدر عزیز ہو جاتا ہے! بہو پہلے پرائے خاندان کی لڑکی ہوتی ہے لیکن "اپنی" ہو جانے کے بعد اولاد کے برابر ہو جاتی ہے، برادرزادے چونکہ "اپنے" خاندان کے کہلاتے ہیں، عموماً زیادہ عزیز ہوتے ہیں بہ مقابلہ ہمشیرزادوں کے جو دوسرے "خاندان کا نام روشن کریں گے۔

زن و شو کی باہمی محبت بھی اسی قانون کی تابع ہے شوہر بیوی پر فریفتہ اور بیوی شوہر کی کیوں جان نثار ہوتی ہے؟ اس لیے ایک دوسرے کے پورے محرم اسرار ہیں، حجاباتِ مغایرت اٹھ چکے ہیں دوئی برطرف ہو چکی ہے، بے تکلفی و یگانگت کے تمام مراتب طے ہو چکے ہیں، رشتہ مواصلت کے معنی یہ ہیں کہ دو

ہستیاں مل کر ایک ہو گئی ہیں، اور جہاں اس قدر یگانگت و یک دلی نہیں ملتی، وہاں اسی نسبت سے محبت باہمی میں بھی کمی پائی جاتی ہے۔

یہی فرقِ مراتب احباب میں بھی نظر آتا ہے، جو احباب ہمارے بالکل "اپنے" ہیں وہی سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتے ہیں، اور جو ہماری ذات سے دور ہیں ان سے تعلقات بھی معمولی ور سمی ہوتے ہیں۔

۳۔ ان کے بعد اپنی جماعت، اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنے مذہب کا مرتبہ ہوتا ہے اپنے مذہب کی توہین کو ہم "اپنی" توہین سمجھتے ہیں۔ ہماری قوم کو اگر کسی نے سخت سُست کہا، تو گویا خود "ہمیں" کہا، وکالت کے پیشہ کو اگر کسی نے بُرا کہا تو ایک وکیل اپنی "ذاتی" توہین سمجھے گا، ڈاکٹری کے فن کو اگر کسی نے ذلیل قرار دیا تو ایک ڈاکٹر اسے "اپنی" ذلت سمجھے گا، انگریز کو ہندوستانی سے جو گریز ہوتا ہے وہ انگریز سے نہیں ہوتا، ہندوستانی کو جو بے اعتمادی انگریز سے ہوتی ہے، وہ ہندوستانی سے نہیں ہوتی، مسلمان مسلمانوں کو بھائی سمجھتا ہے ہندوؤں اور عیسائیوں کو نہیں سمجھتا ہندو ہندوؤں کو ملیچھ نہیں کہتے مسلمانوں اور عیسائیوں کو کہتے ہیں ہر خفیف اشتعال ایک قوم کو غیر قوم سے دست و گریباں کرا دیتا ہے، ہر معمولی واقعہ ایک ملک کو غیر ملک سے سرگرم آویزش کرا دیتا ہے حالانکہ اگر خود اس ملک و قوم کے اندر یہ واقعات پیش آتے ہیں تو کوئی التفات بھی نہیں کرتا اور یہ سب کچھ اسی قانونِ فطرت کی ماتحتی میں ہوتا ہے کہ کوئی نفس خود اپنے سے نہیں لڑتا۔

جو افراد بڑے بڑے محبانِ وطن و ملت ہوتے ہیں اور جو مذہب و وطن کے نام پر اپنی جان دینے کو حاضر رہتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے کو مذہب و قوم کے وجود میں جذب کر دیا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ وہی ہوتے ہیں جو اپنی قوم و مذہب سے الگ اور بے گانہ ہوتے ہیں، یہ سب واقعات اس

قانون کے شواہد مزید ہیں کہ جو شے ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہو وہ ہماری ذات یا جزوِ ذات ہے۔

یہ مسئلہ کا ایجابی و اثباتی پہلو تھا، یہاں تک سب مثالیں وجود محبت و امن کی تھیں اب اس کے منفی و سلبی پہلو پر نظر کرنا چاہیے اور ان مثالوں کو لینا چاہیے جن میں محبت و امن کا فقدان ہوتا ہے۔

عدم محبت کے دو مفہوم ہیں، پہلی صورت یہ ہو کہ جس شخص یا شے سے عدم محبت ہو ساتھ ہی اس سے کسی طرح کی عداوت و نفرت بھی نہیں، اس منزل کے لیے "بے تعلقی" کا لفظ مستعمل ہو، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس سے "نفیاً یا اثباتاً" کسی طرح کا تعلق "ہماری ذات" کو نہیں، عدم محبت کی جتنی مثالیں اس شق کے ماتحت ملیں گی، وہ سب ایسی ہی ہیں، جن میں نفس کو ان اشیاء یا اشخاص سے "بے تعلقی" ہوگی۔

عدم محبت کی دوسری صورت وہ ہے جس میں محبت کا فقدان ہی نہیں بلکہ عداوت، نفرت یا مخالفت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہو، ان مثالوں میں جس شے سے ہمیں عدمِ محبت ہوتی ہو، اور جسے ہم مٹا دینا چاہتے ہیں، وہ وہی ہوتی ہو جس کے وجود کو ہم اپنے وجود یا مویدات و موجبات کے منافی سمجھتے ہیں، ہم جس کے دشمن ہوتے ہیں تو اس کی زندگی یا عزت یا ناموس، یا دولت یا اور کسی شے کو جو "اس کی" ہوتی ہو، مٹا دینا چاہتے ہیں، اس لیے کہ ہمارے نزدیک وہ بھی ہماری زندگی یا عزت یا ناموس، یا دولت، یا اور کسی شے کو جو "ہماری" ہو مٹا دینا چاہتا ہو، اگر دونوں ہستیوں کا یہ تناقض معمولی اور ہلکی باتوں تک محدود ہے، تو ہمارے اس کے شکر رنجی رہتی ہو، لیکن اگر یہ تناقض ہماری اس کی صفات سے گزر کر "ذات" کی گہرائیوں تک پہنچ گیا ہو، تو باہم شدید عداوت پیدا

ہو جاتی ہے۔

یہ وہ واقعات و حقائق ہیں، جن کی تائید پر تاریخ، تجربہ، مشاہدہ سب متحد ہیں، اور ان کے وقوع کی شہادت افراد و اقوام دونوں میں یکساں ملتی ہے، باہمی تعلقات خواہ افراد کے ہوں خواہ اقوام کے ہمیشہ انھیں قوانین کی ماتحتی میں قائم ہوتے رہے ہیں اور آج بھی دنیا کے گوشہ گوشہ میں انھیں شرائط و خصوصیات کے ساتھ امن، نقض امن و بے تعلقی کے قوانین کی کار فرمائی نظر آ رہی ہے۔

اب نتیجہ واضح ہے،

قضایائے بالا کو اگر استقرائی حیثیت سے مرتب کر کے رکھنا چاہیں تو صاف یہ شکل پیدا ہوتی ہے۔

۱۔ خودی کا تعلق جب تک اپنی ذات سے رہا اپنی ذات سے محبت رہی،

۲۔ خودی کا تعلق جب اولاد سے ہو گیا، اولاد سے محبت ہو گئی۔

۳۔ خودی کا تعلق جب اپنے اعزہ سے ہو گیا، تو ان سے محبت پیدا ہو گئی،

۴۔ خودی کا تعلق جب اپنے احباب سے ہو گیا، تو ان سے محبت پیدا ہو گئی'

۵۔ خودی کا تعلق اپنی قوم، مذہب، وطن، جماعت جس کسی سے ہوا، اس سے محبت پیدا ہو گئی۔

اور صرف یہی نتیجہ (حسب طریق طرد) یہ نکلتا ہے کہ تعلقِ خودی یا اطلاق خودی محبت و اتحاد، امن و خلوص کی علت ہے۔

یہ طریقہ انتاج صحیح کے لیے اگرچہ بجائے خود کافی ہے، تاہم اس مسئلہ پر ہم قانون عکس کو بھی منطبق کر کے دیکھتے ہیں، کہ آیا اس سے بھی کوئی نتیجہ نکلتا ہے، اس صورت

میں ترتیب مقدمات حسب ذیل ہوگی۔

۱۔ صلح و محبت کی جتنی مثالیں ملیں، سب میں ہم نے اطلاق خودی کو شریک پایا۔

۲۔ عدم صلح و فقدانِ محبت کی جتنی مثالیں ملیں، ان میں سے کسی میں اطلاق خودی کو موجود نہ پایا۔

اور اس سے بھی وہی نتیجہ نکلتا ہے جو اوپر بیان ہو چکا، یعنی محبت و آشتی صرف انھیں موجودات سے پیدا ہوتی ہے، جو دائرہ خودی کے اندر آجاتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں اطلاق خودی، اتحاد و خلوص کی علت ہے، طریق عکسی جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، منطقیینِ مغرب کے نزدیک سب سے زیادہ مستحکم و قطعی ہے اور جو نتائج اس طریقہ کے مطابق نکلتے ہیں، وہ بالکل یقینی و غیر مشتبہ ہوتے ہیں۔

لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ طریق اختلاف الوصف یا وصف کی مطابقت میں ہم کیفی کی حیثیت کے علاوہ کمی حیثیت سے بھی نتیجہ بالا کی توثیق کر سکتے ہیں۔ اس طریق کے مطابق شکل استدلال یہ ہوگی،

۱۔ اب تک مشاہدہ میں یہ آیا ہے کہ جتنا زیادہ کسی شے سے یگانگت بڑھتی جاتی ہے اور وہ شے ہماری خودی کے دائرہ میں آتی جاتی ہے، اسی مقدار کی مناسبت سے اس سے اتحاد و خلوص بڑھتا جاتا ہے،

۲۔ نیز یہ کہ جس قدر کوئی شے ہماری خودی سے دور اور اس کے معارض پڑتی جاتی ہے اسی مقدار کے تناسب اس سے اتحاد و خلوص کم ہوتا جاتا ہے،

اور یہ استدلال بھی صاف اسی نتیجہ تک پہنچاتا ہے، کہ خلوص و اتحاد کی علت وہی تعلقِ خودی و وابستگی نفس ہے،

معاشرتی مسائل میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی نتیجہ کی صحت پر تین تین طرق استقرا استعمال ہوں، لیکن خوش قسمتی سے اس مسئلہ کو یہ بات حاصل ہو گئی ہے

جس نے اس کی قوت کو سہ چند کر دیا ہے

---- ۞ ----

منطقی گنجلک سے نکل کر اگر عام و سادہ زبان میں نتیجہ بحث کو بیان کرنا چاہیں، تو یوں کہیں گے کہ دنیا میں سارے اختلافات، سارے تناقضات اور ساری کشمکش کی بنیاد دوئی یا کثرت کے عقیدہ پر ہو انسان اپنے سے نہیں ہمیشہ دوسرں سے لڑتا ہو جہاں "من" و "تو" کا خیال آیا معاً کشمکش شروع ہو گئی" انسان اپنی اولاد کو چونکہ اپنا ہی جزو سمجھتا ہو اس لیے اس سے نہیں لڑتا اور جونہی اپنا جزو سمجھنا چھوڑ دیتا ہو، باپ بیٹے میں رشتہ محبت فوراً قطع ہو جاتا ہے، اور باہمی مخالفت بلکہ شدید عداوت سے محفوظ رکھنے والی کوئی شے نہیں ہوتی، یہ جو اس طرح کے واقعات تاریخ کے صفحات میں اور گرد و پیش کی زندگی میں بھی نظر آتے رہتے ہیں، کہ فلاں باپ نے بیٹے پر مقدمہ دائر کر دیا، فلاں بیٹے نے باپ پر ہاتھ چلا دیا، فلاں باپ نے لڑکے کو عاق و محروم کر دیا، فلاں بیٹے نے باپ کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی، یہ سب مثالیں انھیں مواقع کی ہیں کہ "یگانگت" و "وحدت" کا رشتہ ٹوٹ کر آپس میں مغائرت قائم ہو گئی ہو۔

انسان کو اگر کسی سے عشق ہو جاتا ہو تو وہ اس کی خاطر ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہو، معشوق اسے طرح طرح پر ستاتا ہو، چھیڑتا ہو، ذلیل کرتا ہو خطرات میں ڈالتا ہو، لیکن عاشق کی جبینِ تحمل پر شکن تک نہیں پڑتی، ان تمام شدائد کا وہ بہ مسرت استقبال کرتا ہو، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ اپنی ہستی کو معشوق کی ہستی سے الگ نہیں، بلکہ تمام تر اسی کے ماتحت سمجھنے لگتا ہو، اور جب غیریت نہیں باقی رہی تو رد و انکار کے جذبات جو اس پر مبنی ہیں کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں،

پس اگر دنیا میں امن و امان کو پھیلانا، اور صلح و آشتی کی حکومت کو عالمگیر کرنا

منظور ہی، تو اس کی تدبیر صرف یہی ہی، کہ اپنی ذات، اپنی خودی اپنی انانیت کو اس قدر وسعت دی جائے، اتنا پھیلایا جائے کہ سارے عالم و ما فی العالم کے مُرادف کر دیا جائے، قطرہ کی نجات اسی میں ہی کہ وہ اپنے تئیں سمندر میں گم کر دے۔ ع عشرت قطرہ ہی دریا میں فنا ہو جانا؛ خود غرضی، منافست خود بینی کا عفریت صرف محبت مطلق، اخوت عامہ کے مقدس فرشتہ ہی کی مدد سے مغلوب ہو سکتا ہے،

یورپ کی اب تک سب سے بڑی غلطی یہی رہی ہی، کہ اس نے بجائے اس اندرونی انقلاب کے، بجائے باطن انسان میں اس تغیر و اصلاح کے ہمیشہ صرف ظاہری و خارجی تغیرات کو کافی سمجھا، ہیگ میں مجلس صلح کی عدالت و مجلس اقوام کا قیام وغیرہ سب سطحی و نمائشی تدابیر ہیں، جب تک انسان کی روح (اسپرٹ) نہ بدلی جائے گی جب تک انسان کے باطن میں نہ اصلاح ہو گی جب تک قلب انسان کی گہرائیوں سے ضد و عناد، مخالفت و منافست کی جڑیں نہ کاٹی جائیں گی، اوپر کی شاخوں کی کاٹ چھانٹ قیامت تک حصول مقصد میں ناکام رکھے گی،

اس میں شبہ نہیں کہ بعض حکمائے مغرب کا ذہن بھی اس جانب منتقل ہوا ہی اور انھوں نے انسانی آبادی کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کرنا چاہا ہی، چنانچہ نامور فرنچ فلسفی آگسٹ کومٹ نے انیسویں صدی کے وسط میں ایک "مذہب انسانیت" کی بنیاد ڈالی اور اپنے نظام فلسفہ (پازیٹو فلاسفی) میں خدا کی پرستش کے بجائے "انسانیت" کی پرستش لازمی قرار دی علی ہذا سوشلسٹ گروہ (اشتراکیہ) کا بھی نصب العین مساواتِ عامہ و اشتراک انسانیت ہی۔

لیکن اگر کومٹ کے کسی متبع سے یہ سوال کیا جائے، کہ کوئی شخص کیوں انسانیت کی پرستش کرے؟ اس کے نزدیک اسے مسرت و راحت تو اپنے ذاتی

اغراض کے پورے کرنے میں حاصل ہوتی ہی، انہیں چھوڑ کر وہ آخر کیوں ایک وہمی و خیالی ہستی "انسانیت" کی پرستش کرے اور انسانیت کا اپنے اوپر کوئی حق کیوں تسلیم کرے؛ یا اگر کسی سوشلسٹ سے یہ دریافت کیا جائے کہ مراد اہل ثروت کیوں اپنی اپنی جائدادوں سے دست بردار ہوں؟ اور کیوں اپنے زر و مال میں غربا اور اہل حاجت کو برابر کا شریک کریں؟ تو ان سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب نہ ملے گا۔

صلح و امن کی عمارت کو پائدار و مستحکم بنانے اور طوفان جذبات خبیثہ کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے درحقیقت اس سے بہت زیادہ گہری بنیاد کی ضرورت ہی اور یہ بنیاد وہی ہے جسے تصریحات بالا کے بعد ہم وحدت سے موسوم کرتے ہیں جسے صوفیہ کی اصطلاح میں وحدت وجود سے تعبیر کیا جاتا ہی ہم کو خود غرضانہ افعال کے ارتکاب سے ہمیشہ باز رکھنے والا یہ خوف ہرگز نہیں ہو سکتا کہ دوسرے بھی اس کا عوض ہم سے لیں گے۔ علی ہذا مساوات عامہ کی کوشش اس بنا پر بدرجۂ غایت کمزور رہے گی کہ ایک مزدور کے بھی اسی قدر حقوق ہیں جتنے ایک تاجدار کے ہوتے ہیں، ایثار و بے نفسی کی مستقل و پائدار بنیاد کا کام صرف یہ عقیدہ دے سکتا ہی کہ زید و بکر، شاہ و گدا، نیک و بد، مومن و کافر یہ اور وہ، میں اور تو، سب اپنی اصل و سرشت کے لحاظ سے ایک ہیں، ایک ہی نور حقیقت کے پرتو، ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ایک ہی سمندر کی لہریں ایک ہی دریا کے حباب ایک ہی جسم کے اعضا ہیں اور ان میں باہم جو فرق و اختلاف نظر آتا ہی، وہ محض اس لیے کہ "حقیقت یکتا" مختلف اضافتوں اور مختلف نسبتوں کے ساتھ اپنے مظاہر و شئون پیدا کرتی رہتی ہے۔

ہمسایہ و ہم نشین و ہمرہ ہمہ اوست   در دلق گدا و اطلس شہ ہمہ اوست (جامی)

ہم اپنے ہاتھ کو آرام سے رکھتے ہیں مگر کبھی اس پر احسان نہیں رکھتے، ہم اپنے پیر کو چوٹ سے بچاتے ہیں اور کبھی اس سے شکریہ کے طالب نہیں ہوتے ہم اپنے سر کو محفوظ رکھتے ہیں اور اسے فرض سے بھی بڑھ کر اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ کیوں؟ محض اس لیے کہ ہم ان اعضا کو اپنے سے الگ و بیگانہ نہیں بلکہ "اپنے" میں داخل سمجھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک عضو کی بے کلی کو "اپنی" اذیت و بے کلی محسوس کرتے ہیں پس اگر ہمارا یہی تخیل تمام عالم کے متعلق "قائم" ہو جائے اور کل موجودات کو ہم "اپنے" میں داخل سمجھنے لگیں تو یہ بالکل یقینی ہے کہ نیکی اور نیک چلنی حسن سلوک و مواخات، ایثار و خدمت خلق کے اعمال ہم سے "اضطراراً" سرزد ہونے لگیں،

دنیا کا عام نظام اخلاق نیکی کی تعلیم اس لیے دیتا ہے کہ اس سے عمدہ معاوضہ کی توقع رہتی ہے، ہم اگر آج کسی کی ضرورت پر قرض دیں گے، تو ممکن ہے کل ہم کو بھی قرض لینے کی ضرورت پڑ جائے اور وہ اسی شخص سے پوری ہو، ہم اگر دوسروں کی بہو بیٹیوں کی عزت ملحوظ رکھیں گے تو دوسرے بھی ہماری بہو بیٹیوں کا پاس ناموس کریں گے لیکن عقیدۂ وحدتِ عالم کی تعلیم اس توقع معاوضہ و اصول داد و ستد سے بالاتر ہے، اس مرتبہ پر نیکی محض اس لیے کی جاتی ہے کہ اس سے خود اپنے نفس کی تکمیل ہو گی، جس سے خود اپنی ذات عروج و ترقی کی کچھ اور منازل طے کرے گی اور تعینات و تشخصات کے کچھ حدود و قیود ٹوٹ کر اطلاق و کمال کی منزل قریب ہوتی جائے گی۔

اس صورت میں امن و صلح کا تعلق بھی مثل دوسری نیکیوں کے "حقوق" کے ساتھ نہیں رہ جاتا، بلکہ یہ چیزیں انسان کے لیے بہ منزلہ "فرض" اصلی کے ہو جاتی ہیں اور فرض بھی اس درجہ کا جس کے سامنے کھانے پینے، سوتے، پہنے، چلنے پھرنے حوائج فطری کی قوت ماند پڑ جاتی ہے،

اخلاقی حیثیت سے پست ترین انسان وہ سمجھا جاتا ہو جو محض اپنی شکم پروری کو مقصود زندگی سمجھتا ہی، یہ وہ شخص ہوتا ہی جو صرف اپنے جسم اور اپنی جان کو "اپنے" میں داخل سمجھتا ہی، اس سے بہتر وہ شخص ہوتا ہی جو اپنے خاندان کی کفالت کرتا ہی، اور اس سے بہتر وہ جو اپنے قصبہ یا شہر یا اپنے فرقہ کی خدمت اپنا فرض سمجھتا ہی، یہاں تک کہ متعارف نظام اخلاق کی رو سے بہترین شخص وہ ہی جو اپنی قوم مذہب و وطن کو جان کے برابر عزیز رکھتا ہی، لیکن اِس مسلک توحید کے لحاظ سے دائرہ نظر اس سے بھی وسیع تر ہو جاتا ہی، اور ہر ملک ہر قوم اور ہر فرقہ کے ساتھ یکساں محبت و یگانگت کا برتاؤ لازمی ہو جاتا ہی۔

سعدی نے اسی مرتبہ پر پہنچ کر کہا ہو کہ "کل انسان" نہ صرف ایک مذہب کے پیرو متحد الاصل اور ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہیں کہ کسی ایک عضو کی تکلیف گویا ہر دوسرے عضو کی بھی تکلیف ہی

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ۔۔۔ کہ در آفرینش زیک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار ۔۔۔ دگر عضوہا را نہ ماند قرار

تمام موجودات کی اصل ایک ہی، فروع خواہ جتنے ہوں، ذات ایک ہی صفات خواہ کتنے ہی ہوں، نور ایک ہی پر تو خواہ جتنے ہوں،

جملہ یک ذات است اما متصف ۔۔۔ جملہ یک حرف ست اما مختلف

مولانائے روم اسی حقیقت یکتا کی تعبیر و توضیح اپنے یکتا طرز و انداز میں یوں کرتے ہیں"

گر ہزاراں اند یک کس بیش نیست ۔۔۔ جز خیالات عدد اندیش نیست

بحر وحدانی ست جفت و زوج نیست ۔۔۔ گوہر و ماہیش غیر موج نیست

نیست اندر بحر، شرک ہیچ ہیچ ۔۔۔ لیک با احول چہ گویم ہیچ ہیچ

اصل بیند دیدہ چوں اکمل بود ۔۔۔ دو ہمی بیند چو مرد احول بود

باب (۵)

مسیحیت اور امن

یہاں تک جو کچھ گفتگو تھی، وہ عقلی حیثیت سے تھی لیکن دنیا کی بہت بڑی آبادی مذہبی افراد پر شامل ہے. جن کے لیے علم و عقل، فلسفہ و منطق کا کوئی فتویٰ حجت نہیں ہو سکتا، ان کے لیے اگر واجب العمل احکام ہیں تو صرف مذہب کے، ان کی تسکین اگر ہو سکتی ہے تو محض ارشادات مذہب سے ضرورت ہے کہ ان سے تخاطب کے وقت ان کے عقائد و باطنی احساسات کا بھی لحاظ رکھا جائے، لیکن کیا کسی مذہب کی تعلیم امن و امان صلح و آشتی کے کچھ بھی منافی ہے۔

مذاہب کی تعداد اگرچہ بہت زائد ہے لیکن اس وقت صرف چار مذاہب ہیں جن کے ماتحت دنیائے متمدن کی بیشتر آبادی منقسم ہے، مسیحیت۔ اسلام۔ بدھ مت۔ اور ہندو مذہب، ان میں سے بدھ مذہب کی جو تعلیم اس باب میں ہے اس کا حال بچہ بچہ کو معلوم ہے، ہر شخص جو اس مذہب سے سرسری واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ یہ مذہب دنیا سے خونریزی کو مٹانے کے لیے آیا تھا اور اس کا اصلی مقصد نفس کشی کی تلقین کرنا تھا، گوتم بدھ کے ارشادات پر اگر انسان پوری طرح

عمل کرے تو ساری عمر جہاد نفس کی نذر ہو جائے گی اور ایک لمحہ کی بھی اس کی فرصت نہ ہو سکے گی، کہ دوسروں سے مقابلہ و مقاتلہ کی نوبت آئے یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے، جس کے لیے کسی تفصیلی ثبوت کی ضرورت نہیں،

ہندوؤں کی کتب مقدسہ کے بعض حصوں میں بے شک جنگ و جدل کی تعلیم ملتی ہو بلکہ فن حرب و قتال کے اصول و ضوابط بھی بتائے گئے ہیں، لیکن عام روح جو ان کے صحف مقدسہ میں سرایت کیے ہوئے ہو، وہ صلح و امن و مصالحت ہی کی ہو اس سے قطع نظر کرکے اس وقت ہندوؤں کے ہاتھ میں کوئی سلطنت نہیں، اور چونکہ بڑے پیمانہ پر جدال و قتال کی اصلی تکسالیں حکومتیں ہی ہوتی ہیں اس لیے پیام امن پر گویا وہ اضطراراً عمل کر رہے ہیں، ایک محتاج و بینوا کے سامنے اسراف کی خوبیوں پر وعظ کہنا تحصیل حاصل ہو۔

ان دونوں مذاہب کے نکال دینے کے بعد صرف مسیحیت و اسلام باقی رہ جاتے ہیں اور کچھ عرصہ سے یہی دو قومیں ایک دوسرے کی حریف بھی نظر آرہی ہیں، اس لیے ان کی تعلیمات پر ذرا تفصیل سے نظر کرنے کی ضرورت ہو، ان میں ترتیباً مسیحیت کو تقدم حاصل ہو، نہ صرف زمانہ تاریخی کے لحاظ سے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ اس وقت دنیا کی بیشتر حکومتوں پر بچشم ظاہر کو اسی مذہب کا پرچم لہراتا نظر آتا ہو۔

عیسائی قومیں اور حکومتیں صدہا سال سے جس جوش و خروش، ہمت و استقلال کے ساتھ کبھی باہم اور کبھی اغیار سے محاربہ و مقاتلہ میں مصروف ہیں جس خلوص سے ان کے خالص مذہبی حلقوں میں ان کی ان سرفروشیوں کی داد دی جاتی ہو، اور شان و اہتمام کے ساتھ کلیساؤں میں ان کی فتح یابی کی دعائیں مانگی جاتی ہیں ان سب واقعات سے قیاس ہوتا ہو کہ جدال و قتال مذہب عیسوی

میں نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوگا، لیکن آیئے دیکھیں ان کی "کتاب مقدس" کے اس باب میں کیا احکام وارشادات ہیں۔

حضرت مسیح کی ساری تعلیم کا لب لباب ان کے اس وعظ میں موجود ہے جو انھوں نے کوہ زیتون پر جاکر ارشاد فرمایا تھا، اس میں وہ تصریح وتاکید کے ساتھ نہ صرف خوں ریزی کو "قطعاً" حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ درشت گوئی وسخت کلامی کو بھی بالکل ناجائز بیان فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے،

"تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کر، اور جو کوئی خون کرے گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی[1] پر غصہ ہوگا، وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا، اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا، وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہوگا، اور جو اس کو احمق کہے گا وہ آگ کے جہنم کا سزاوار ہوگا، پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزرانتا ہو اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے بھائی کو مجھ سے کچھ شکایت ہے تو وہیں قربانگاہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے اور جاکر پہلے اپنے بھائی سے ملاپ کر تب آکر اپنی نذر گزران جب تو اپنے مدعی کے ساتھ راہ میں ہے اس سے جلد صلح کرلے"۔ (متی۔ ۵)

گویا بارگاہ خداوندی میں نذر ونیاز پیش کرنے سے یہ کہیں بہتر وافضل ہے کہ ابناء جنس کے دلوں میں اپنی طرف سے خفیف گنجائش رنجش بھی نہ چھوڑی جائے پھر صرف یہی نہیں کہ دوسرے دل سے دشمنی نہ رکھنا چاہیے، یہی نہیں کہ دشمنوں سے اپنی خطا معاف کراکے صفائی کرلینی چاہیے، یہی نہیں کہ دل کو رنجش وکینہ سے صاف رکھنا چاہیے، بلکہ ارشاد یہ ہے کہ دشمنوں سے دلی الفت ومحبت رکھنا چاہیے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہنا چاہیے۔ ارشاد ہے۔

---

[1] بھائی سے مراد ابنائے نوع انسان یا اپنے اخوان جنس سے ہے۔

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیئے دعا مانگو، تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہی بیٹے ٹھہرو، کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہی، اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینھ برساتا ہی، کیونکہ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمھارے لیے کیا اجر ہی؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ اور اگر تم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو کیا غیر قوموں کے لوگ بھی ایسا نہیں کرتے، پس چاہیے کہ تم کامل ہو، جیسا تمھارا آسمانی باپ کامل ہی۔" (متی ۵)

لیکن اگر ہم پر کوئی شخص عملاً ظلم و زیادتی کرنے لگے، کیا اُس وقت ہم مدافعت کا بھی خیال نہ کریں؟ انجیل کا جواب ہی کہ قطعاً نہیں بلکہ ایسے موقع پر ہمیں انتہائی لینت و عالی ظرفی سے کام لے کر اپنی مظلومیت کو زیادہ بڑھا دینا چاہیے،

"تم سن چکے ہو کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے، اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بے گار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۵)

کیا اس انکسار و فروتنی، اس حلم و لینت، اس ایثار و بے نفسی سے بڑھ کر دینا میں کوئی اور تعلیم مل سکتی ہی؟ کیا جو لوگ انجیل کو کلام الٰہی مانتے ہیں یا اپنے تئیں حضرت مسیح کی اُمت میں ظاہر کرتے ہیں، ان کے طرز عمل میں اس لحاظ سے مرتبہ ملکوتیت سے کوئی بات بھی کم ہونی چاہیے؟ اس تعلیم کے بعد اگر بُت پرست

اقوام حضرت مسیحؑ کو صلح و امن کا دیوتا تسلیم کریں تو اس پر کچھ بھی تعجب ہو سکتا ہے۔
دنیا میں اکثر مناقشات زر و زمین ہی کے لیے ہوتے ہیں، معمولی رنجشوں
سے لے کر بڑی بڑی سلطنتوں کے محاربات عظیم تک کی تہ میں اکثر یہی طمع یا
حبِ زر کا جذبہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، اس لیے اگر انسان سے یہ جذبہ ہٹ جائے
تو اکثر مناقشات و خوں ریزیاں از خود فنا ہو جائیں گی، اس بنا پر دیکھنا یہ ہے کہ
حضرت مسیحؑ نے مال و دولت کا کیا درجہ قرار دیا ہے، فرماتے ہیں،

اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو، جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے
اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، اور بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع
کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ، اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے
ہیں ۔۔۔ کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا، کیونکہ یا تو ایک سے
عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز
جانے گا، تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔" (متی ۶)

جو لوگ سامانِ معیشت کی تلاش و فراہمی میں مصروف رہتے ہیں، اُن سے
خطاب ہوتا ہے،

"ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں
تو بھی تمھارا آسمانی باپ اُن کو کھلاتا ہے، کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے ۔۔۔
اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے
دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں تو بھی میں تم سے
کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی
کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا، پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے
اور کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں

پہنائے گا، اس لیے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پہنیں گے، کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں، اور تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔" (متی ۶)

اگر اس تعلیم کے کسی جزو پر بھی عمل ہوتا، تو یورپ کی گزشتہ جنگ کا وقوع ممکن تھا؟ نفسانیت و حسد کا ایک بہت بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان کی نظر دوسرں کے عیوب پر رہتی ہے اور اپنی صحبت میں دوسروں پر نکتہ چینی کرتا رہتا ہے حضرت مسیح نے فتنہ و فساد کے اس شجرِ ممنوعہ کی پوری طرح بیخ کنی کر دی ہے،

"عیب جوئی نہ کرو کہ تمہاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے کیونکہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو، اسی طرح تمہاری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو اسی اعتبار سے تمہارے واسطے بھی ناپا جائے گا، تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے، اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا؟ اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا تیری آنکھ میں سے تنکا نکال دوں؟ اے ریاکار پہلے اپنی آنکھ میں سے شہتیر نکال پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی طرح دیکھ کر نکال سکے گا۔"

(متی ۷)

عفو و درگزر کے متعلق تصریح کے ساتھ یہ وعدہ موجود ہے، کہ

"اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہارے قصور معاف کرے گا، اور اگر تم آدمیوں کے قصور نہ معاف کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصور معاف نہ کرے گا۔" (متی ۶)

یہ عفو و درگزر کی خصلت اگر عام ہو جائے، تو دنیا سے فی الفور فساد و بدامنی کا خاتمہ ہو جائے، اسی وعظ کے آغاز میں حضرت مسیح نے اپنے سچے پیرووں کی

خود ہی کچھ علامات بتائی ہیں یہ سعادت کن لوگوں کے نصیب میں آسکتی ہو صرف منکسر، غمگین، حلیم، راست باز، رحم دل، پاکباز و صلح جو افراد کے نصیب میں،

"مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کہ آسمان کی بادشاہت انھیں کی ہو۔"

"مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں، کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔"

"مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے۔"

"مبارک ہیں وہ جو رحم دل ہیں، کیونکہ اُن پر رحم کیا جائے گا۔"

"مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں، کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔"

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے" (متی ۵)

یہ معیار خود حضرت مسیح کا قائم کیا ہوا ہو اس کے مطابق جانچ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ مسیحی یورپ کے کتنے فرد حقیقتہً "مسیحی کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اقتباسات بالا مسیح کے وعظ کوہ کے تھے، لیکن اس کے علاوہ بھی ساری انجیل اسی قسم کی تعلیمات سے لبریز ہی، عجز و انکسار، حلم و فروتنی، عفو و درگزر، الفت و محبت، ایثار و بے نفسی کے جلوے قدم قدم پر نظر آتے ہیں اور ظلم و زیادتی و پیش دستی تو کجا، مدافعانہ خوں ریزی کا بھی جواز نہیں ملتا۔

ایک مرتبہ کسی شاگرد نے دریافت کیا کہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کون ہو؟ اس کے جواب میں حضرت نے ایک بچہ کو بلا کر ان کے بیچ میں کھڑا کر دیا، اور کہا کہ "...... جو کوئی اپنے آپ کو اس بچہ کی مانند چھوٹا بنائے گا، وہی آسمان کی بادشاہت میں بڑا ہوگا۔ [۱]

ایک مرتبہ ایک اور شاگرد نے آکر دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص میرا گناہ کرتا ہے

---

[۱] متی، باب ۱۸ لوقا باب ۹۔

تو اسے کتنی مرتبہ معاف کرنا چاہیے؟ سات مرتبہ تک؟ اس کے جواب میں اس خدائے حلیم کا ارشاد ہوا کہ

”سات دفعہ نہیں بلکہ سات دفعہ کے ستر گنے تک!“[۵۱]

کاش موجودہ یورپ کو اس ارشاد کے عشر عشیر پر بھی عمل کی توفیق ہوتی!

حضرت مسیح کو زر و مال، دولت و ثروت سے جو نفرت تھی، اس کا اندازہ ان کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے، کہ

”دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔“[۵۲]

معلوم نہیں کہ انجیل کے جو نسخے یورپ کے شاہان تجارت کے کتب خانوں میں موجود ہیں ان میں ارشاد بالا درج ہے یا نہیں،

اس سے بھی بڑھ کر یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی دولت مند شخص نے آ کر دریافت کیا کہ حیاتِ ابدی کے حصول کا کیا ذریعہ ہے، آپ نے جواب دیا، کہ ”احکام خداوندی پر عمل کرو، اور وہ احکام یہ ہیں کہ خون نہ کر، زنا نہ کر، چوری نہ کر، جھوٹی گواہی نہ دے، اپنے باپ اور ماں کی عزت کر، اور اپنے پڑوسی سے اپنے ہی مانند محبت رکھ۔“ سائل نے عرض کیا کہ ”ان احکام پر تو آغاز عمر سے عمل کر رہا ہوں“ ارشاد ہوا کہ ”مگر ابھی ایک بات کی تجھ میں کمی ہے۔ جا اور جو کچھ تیرا ہے، بیچ کے غریبوں کو دے آ، تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا!“ مگر اس بدنصیب پر حبِ زر غالب تھا، محروم واپس چلا گیا[۵۳]

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ ”افسوس ہے تم پر جو دولت مند ہو

---

[۵۱] متی باب ۱۸ [۵۲] متی باب ۱۹، لوقا باب ۱۸، مرقس باب ! [۵۳] مرقس باب ۱۰، متی باب ۱۹،

کیونکہ تم اپنا اجر پا چکے[1] (یعنی آخرت میں تمھارے لیے کچھ نہیں ہی)

ان تصریحات کے بعد موجودہ مسیحی اقوام اپنے ہی عقاید کی رو سے اپنے حشر کی بابت کس قسم کی توقعات رکھ سکتی ہیں؟

متی کی روایت کے مطابق حضرت نے پہاڑ پر جاکر جو وعظ فرمایا تھا اس کے اقتباسات اوپر گزر چکے ہیں، لوقا نے بھی اس وعظ کے خلاصہ کو اپنی زبان میں قلم بند کیا ہی، اس کے مطالعہ سے حقیقی مسیحی تعلیم کا سماں ایک بار پھر نظر کے سامنے پھر جائے گا۔

"میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو، جو تم سے عداوت رکھیں اُن کا بھلا کرو جو تم پر لعنت کریں، ان کے لیے برکت چاہو جو تمھاری بے عزتی کریں ان کے لیے دعا مانگو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے، اور جو تیرا چوغہ لے اس کو کرتہ لینے سے بھی نہ منع کر، جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تیرا مال لے لے اس سے طلب نہ کر..... اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمھارا کیا احسان ہی، کیونکہ گناہ گار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں" اور اگر تم انھیں کا بھلا کرو، جو تمھارا بھلا کرتے ہیں تو تمھارا کیا احسان ہے کیونکہ گناہ گار بھی ایسا ہی کرتے ہیں...... تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو، اور بغیر نا امید ہوئے قرض دو، تو تمھارا اجر بڑا ہوگا، اور تم خدا کے بیٹے ٹھہروگے، کیونکہ وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہی، جیسا تمھارا باپ ہی ایسے ہی تم بھی رحم دل ہو، عیب جوئی نہ کرو، تمھاری بھی عیب جوئی نہ کی جائے گی، مجرم نہ ٹھہراؤ، تم بھی مجرم نہ ٹھہرائے جاؤگے، خلاصی دو تم بھی خلاصی

---

[1] لوقا باب ۶

پاؤ گے، دیا کرو تمھیں بھی دیا جائے گا، اچھا پیمانہ داب داب کر، اور ہلا ہلا کر اور لبریز کر کے تمھارے پلہ میں ڈالیں گے کیونکہ جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو اسی سے تمھارے لیے ناپا جائے گا۔"[1]

کیا مسیحی اقوام کے طرز عمل کو اس تعلیم سے کوئی ادنیٰ مناسبت بھی ہے؟

مسیحی اقوام شاید اس خیال میں ہیں کہ فتوحات ملکی انھیں صراط مستقیم کے قریب لے آئیں گی، لیکن ان کے خدا کا فرمان یہ ہے، "کہ خدا کی بادشاہت ظاہری طور پر کبھی نہ آئے گی جسے مکان و جہت کے مادی قیود سے متعین کر کے بتایا جا سکے گا، بلکہ وہ محض باطنی بادشاہت ہی، جو نفوس انسانی کے اندر اس وقت بھی موجود ہے۔"[2]

موجودہ متمدن دنیا میں خودداری کا جو مفہوم شائع ہی، اس کے لحاظ سے یہ واقعہ کس قدر عجیب ہے کہ جو لوگ حضرت مسیح پر ایمان لے آئے تھے، بلکہ جو موجودہ مسیحیوں کے بہ قول انھیں خدا سمجھتے تھے، خود حضرت مسیح اپنے ہاتھوں سے ان کے پیر دھوتے تھے اور انھیں رومال سے پونچھتے تھے،[3] یہ طرز عمل "خدا" کا بندوں کے ساتھ تھا، لیکن کیا اس وقت بندے خدا کے مقابلے میں بھی اسی فروتنی و انکسار کے استعمال پر آمادہ ہیں؟

آج جو قومیں اپنی عظمت کی تلاش ادعا و تعلی، خود بینی و خودنمائی میں کر رہی ہیں ان کے کان اس پیام ربانی کی طرف سے بہرے ہیں، کہ

"جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا اور جو اپنے آپ چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔"[4]

جس وقت حضرت مسیحؑ کو سرکاری پیادوں نے حملہ کر کے گرفتار کیا ہے،

---

[1] لوقا باب ۶۔ [2] لوقا باب ۱۷، [3] یوحنا باب ۱۳، [4] لوقا باب ۱۴،

اس وقت ایک حواری سے ضبط نہ ہو سکا، اور اس نے حملہ آوروں میں سے ایک پر وار کر ہی دیا، لیکن رحم و رافت، عفو و حلم کے منظر ربانی نے اس وقت فوراً اپنے جاں نثار کو سرزنش کی کہ

"اپنی تلوار میان میں کر، کیونکہ جو جو تلوار کھینچتے ہیں، وہ سب تلوار سے ہلاک کیے جائیں گے"۔ اگر جرمنی و انگلستان، روس، فرانس، آسٹریلیا و اٹلی، قدیم روم و جدید امریکا کے کلیساؤں میں اس پیام امن کی منادی ہوتی رہتی، تو آج دنیا کی تاریخ کس قدر مختلف ہوتی! رومی تاجداروں کی سفاکیاں اور ان کے زمانہ کے مناظر سیانی، شاہان روس کی خون آشامیاں، نپولین کی خونریزیاں انقلاب فرانس کے شدائد تیرھویں صدی عیسوی کے محاربات صلیبی انگریزی حکومت کی لوٹ ... امارکوزم کی شریعت قتل و غارت ہڑتالوں، بلووں اور بغاوتوں کا تسلسل بالشویکوں کی ستم آرائیاں اور گزشتہ عالمگیر جنگ کی حشر انگیزیاں، ان میں سے کسی شے کا بھی وجود ہوتا؟ لیکن شاید فطرت کو یہ منظور نہ تھا، کہ دنیا جنت بن جائے کہ پھر اس صورت میں جنت کی تمنا ہی کس کو رہ جاتی؟

ان تصریحات کے بعد اور مسیحوں کے اس طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر جو مسیحیت کے سرتاسر منافی ہے، اگر روح اللہ کی روح سے آج یہ صدا آ رہی ہو، تو کیا عجب ہے۔

"یہ اُمت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے لیکن ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں" (مرقس: باب ۷)

باب (۶)

اسلام اور امن

مسیحیت کے جو احکام امن سے متعلق ہیں، اُن کی تصریح گزر چکی، لیکن اُس مذہب کی اس باب میں کیا تعلیم ہے جس کے پیروؤں کی تعداد کہا جاتا ہے کہ دنیا میں اس وقت تیس کروڑ ہے، جس کا نام "عقلاء یورپ" نے مذہبِ شمشیر رکھا ہے جس کے متعلق دانایانِ فرنگ کا دعویٰ ہے کہ وہ قتل و خوں ریزی کا معلم ہے اور جس کے یہاں جہاد ایک فریضہ مذہبی کی حیثیت رکھتا ہے، جس اُمت کے پیمبر نے بارہا خود جہاد کیا ہو، جس شریعت نے مقاتلہ کفار کو وسیلہ جنت بتایا ہو، جس مذہب نے غزوات کو اعمال حسنہ میں سب سے اونچے درجے پر رکھا ہو، ایسے مذہب اور ایسی شریعت سے بھلا تائید امن و آشتی کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ اس کے ہاں تو قدم قدم پر جدال و قتال، کشت و خون کی تاکید ملے گی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی مذہب نے امن و امان کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے، اور مستقل پائدار حالت امن کے اسباب و بواعث کے بہم پہنچنے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، تو وہ اسلام ہی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قیام امن کی تاکید اپنے اپنے

پیروؤں پر دنیا کے ہر مذہب نے رکھی ہی، لیکن اسلام کی فضیلت مخصوص یہ ہے کہ اس نے جس اہتمام کے ساتھ اس مقصد کے حصول پر زور دیا ہی، جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کے تدابیر و ذرائع بیان کیے ہیں، اور جس جامعیت کے ساتھ اس کے موجبات و موانع پر نظر کی ہی، اس کی نظیر سے دنیا کا مذہبی لٹریچر خالی ہی،

اوپر کے کسی باب میں دکھایا جا چکا ہو کہ دنیا کے سارے اختلافات و مناقشات کی بنیاد انسان کے جذبۂ خودی پر ہو۔ جس کے باعث ایک کو دوسرے سے مغائرت پیدا ہوتی ہی، اور یہی رفتہ رفتہ مخالفت بلکہ منافرت کی شکل اختیار کر لیتی ہی، اس زہر کا سب سے بڑا تریاق عقیدۂ توحید ہی، یعنی اگر انسان کو دوسروں سے کوئی اصولی اختلاف نہ نظر آئے، وہ اپنے آپ کو تمام موجودات سے متحد سمجھنے لگے، اور بجائے کثرت و تعدد کے اسے ہر طرف وحدت ہی کی جلوہ آرائیاں نظر آنے لگیں، تو عداوت بلکہ مغائرت و اجنبیت تک کا جذبہ اس کے دل سے محو ہو جائے اور کائنات میں ہر سمت امن و آشتی کی منادی ہو جائے۔

اسلام کا اصلی کارنامہ یہ ہی کہ اس نے اپنے نظامِ عقائد میں بلند ترین مرتبہ اسی عقیدہ توحید کو دیا ہی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسلام کا مقصد حقیقی صرف منادیٔ توحید ہی، باقی اور تمام مسائل ضمناً و فرعاً آ گئے ہیں، مخالفین تک کو یہ تسلیم ہی کہ عقیدۂ توحید جس مکمل صورت میں اسلام میں ملتا ہی، اور کہیں نہیں ملتا اگر وہ تمام آیات قرآنی جن میں توحید کی دعوت اور شرک کی مذمت ہی یکجا کی جائیں تو ایک اچھی خاصی ضخامت کی مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہی، خلاصہ ان سب کا یہ ہی کہ تمام کائنات کی اصل خدا، اور صرف خدا ہو اور اس کے سوا اور کسی ہستی کی جانب خلق، امر یا وجود حقیقی کا انتساب کرنا شرک ہو۔

جن لوگوں کا عقیدہ توحید راسخ ہے، جو لوگ اس پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہستیٔ مطلق انسان کی رگِ جان سے بھی قریب[1] تر ہے جو اشخاص اس پر یقین رکھتے ہیں کہ موجودات کے ذرہ ذرہ کا مبداء و مرجع صرف وہی ذاتِ واجب الوجود[2] ہی ہے جن افراد[3] کو اس کا اذعان ہے کہ ہر شے کی ابتدا و انتہا، ظاہر و باطن سب خدا ہی[4] ہے جن نفوس کا اس پر ایمان ہے کہ جملہ حوادثِ عالم محض مشیتِ باری ہی کے مختلف مظاہر و شئون ہیں[5]، اور جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ کفر و ایمان دونوں کا خالق ایک ہی ہے بھلا وہ کبھی اور کسی حالت میں بھی کسی سے عداوت و منافرت کا جذبہ از راہ نفسانیت رکھ سکتے ہیں، اگر کسی صنعت کی تنقیص کرنا صانع کی تنقیص کو مستلزم ہے، تو مخلوقات میں سے کسی کی عیب جوئی کرنا بدرجۂ اولیٰ اس کے خالق کی کھلی ہوئی توہین و تنقیص ہوگی۔

پھر قرآن نے صرف روحانی اتحادِ اصل و اشتراک پر بس نہیں کی، بلکہ تصریح کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جسمانی و مادی حیثیت سے تمام نسلِ انسانی ایک ہی خاندان کی ہے، سب کے والدین ایک ہی ہیں، اور آج دنیا میں جو مختلف جماعات و قبائل نظر آ رہے ہیں، سو یہ تقسیم صرف اس لیے ہے کہ باہمدگر امتیاز و شناخت ہو سکے،

یا ایہا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ و جعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا (حجرات ع ۲)	اے انسانو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان و قبائل بنائے تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جاؤ۔

اس اتحادِ اصل و نسل کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد مغائرت و منافرت

---

[1] نحن اقرب الیہ من حبل الورید [2] انہ ھو یبدئ و یعید [3] والیہ ترجع الامور [4] وانا الیہ راجعون [5] والیہ المصیر وغیرہ [6] ھو الاول والآخر والظاھر والباطن [7] قل کل من عند اللہ [8] ھو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن

کا شائبہ تک نہیں باقی رہ سکتا ہے۔

شرک سے قطع نظر کرکے جو تمام تر ایک ذہنی و اعتقادی مسئلہ ہے، اعمال کی فہرست میں اسلام نے بدترین معصیت فتنہ و فساد کو قرار دیا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے شدید ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں اور تکرار و تواتر کے ساتھ اس سے محترز رہنے کی تاکید آئی ہے، آیات ذیل ملاحظہ ہوں۔

الذین ینقضون عہد اللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض اولئک ھم الخسرون ۰ (بقر رک ۳)	جو لوگ خدا کا عہد ایک مرتبہ باندھ چکنے کے بعد توڑتے ہیں اور خدا نے جن رشتوں کے جوڑے رہنے کا حکم دیا ہے، انھیں کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں، وہی گھاٹے میں رہیں گے
ولا تعثوا فی الارض مفسدین (بقر رک ۷)	زمین پر فساد کرتے نہ پھرو۔
واللہ لا یحب الفساد (بقر رک ۲۵)	خدا فساد کو پسند نہیں کرتا۔
واللہ لا یحب المفسدین (مائدہ رک ۹)	خدا مفسدین کو دوست نہیں رکھتا۔
ولا تبغ الفساد فی الارض (قصص رک ۸)	زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

یہ چند آیات نمونہ کے طور پر درج کی گئیں۔ ورنہ اس مضمون کی کل آیات بیسیوں کی تعداد میں موجود ہیں،

اسلام نے صرف فتنہ و فساد کو معصیت کبریٰ قرار دینے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جو چیزیں محرکِ فساد ہو سکتی تھیں، سب سے انھیں کی جڑ کاٹ دی۔ دنیا میں جتنے محاربات برپا ہوتے رہتے ہیں، عموماً ان کی تہ میں حبِ جاہ، حبِ زر، حبِ اقتدار کے جذبات کام کرتے ہوتے ہیں، جرمنی اس لیے اعلانِ جنگ کرتا ہے، کہ انگریزوں کے بحری مقبوضات اس کے مقابلہ میں بہت زائد ہیں، انگلستان اس لیے مصروفِ پیکار ہوتا ہے

جرمنی کی روز افزوں طاقت سے اسے اپنی قوت کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے غرض اسی طرح اکثر جنگ کے پردہ میں مال و دولت کی طمع کام کرتی ہوتی ہے۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کے سامنے جس فردوس عمل کا نقشہ پیش کیا ہے اس میں "شجرِ ممنوعہ" اسی دنیوی مال و دولت کو قرار دیا ہے کہ جب اس مادی زندگی کی محبت ہی دل سے نکل جائے گی تو مسابقت و منافرت کا از خود خاتمہ ہو جائے گا۔ قرآن نے صدہا مختلف پیرایوں اور اسلوبوں سے حیات دنیوی کی مذمت و منقصت کی ہے اور اس کی بے ثباتی پر سطر سطر میں زور دیا ہے مثلاً

زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذہب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب (آل عمران رکوع ۲)

انسان کی فطرت ایسی ہے کہ اسے مرغوباتِ دنیوی مثلاً ازواج و اولاد و زر و سیم کے ڈھیر کے ڈھیر اور عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتوں کے ساتھ دل بستگی ہوتی ہے حالانکہ یہ دنیوی زندگی کے عارضی فوائد ہیں اور رہنے کا اچھا ٹھکانہ تو وہی اللہ کے ہاں ہے

واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنۃ (انفال رکوع ۳)

اور تم واقف ہو کہ تمہاری اولاد اور تمہارا مال تمہارے لیے فتنہ ہے۔

یقوم انما ہذہ الحیوۃ الدنیا متاع وان الآخرۃ ہی دار القرار (مومن رکوع ۵)

اے قوم یہ حیات دنیوی محض چندروزہ ہے اور مستقل جگہ تو وہی آخرت ہے۔

انما الحیوۃ الدنیا لعب ولہو (محمد رکوع ۴)

یہ حیات دنیوی تو محض ایک کھیل تماشا ہے،

وما ہذہ الحیوۃ الدنیا الا لہو ولعب وان الدار الآخرۃ لہی الحیوان (عنکبوت رکوع ۷)

یہ دنیوی زندگی تو محض ایک کھیل تماشا ہے اور دار آخرت ہی کی زندگی اصل زندگی ہے۔

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولہو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر

جانے رہو کہ حیات دنیوی بس یہی کھیل تماشا ظاہری طمطراق آپس میں ایک دوسرے پر

فی الاموال والاولاد (حدید رک ۳)

فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال و اولاد کا خواستگار ہوتا ہے۔

زین للذین کفروا الحیوٰۃ الدنیا (بقرہ ع ۲۶)

جو لوگ کافر ہیں، ان کی نظروں میں ہم نے حیات دنیوی کو زینت دے رکھی ہے۔

وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور (آل عمران ع ۱۹)

دنیا کی زندگی بجز دھوکے کی پونجی کے اور کچھ نہیں۔

ایک جگہ یہاں تک کہہ دیا ہو کہ آسمانی بادشاہت صرف انھیں لوگوں کا حصہ ہی جو دنیوی حیثیت سے مسکین اور مادی کشمکش سے الگ رہتے ہیں،

تلک الدار الاخرۃ نجعلہا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین (قصص رک ۹)

یہ آخرت کا گھر مخصوص انھیں لوگوں کے لیے ہو، جو دنیا میں اپنی برتری کے خواہاں نہیں ہیں اور فساد نہیں کرتے اور انجام بخیر تو پرہیزگاروں ہی کے حصہ میں ہو۔

جس شریعت نے دنیا اور حیات دنیوی کا مرتبہ اس قدر پست رکھا ہو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی روادار نہیں ہو سکتی کہ اس پر ایمان رکھنے والی قوم، دولت و جاہ سلطنت و حکومت، زر و زمین کے لیے تلوار ہاتھ میں لے،

ان تصریحات کے پہلو بہ پہلو قرآن نے بالواسطہ بھی نفس انسانی میں دنیا کی بے ثباتی اور دولت و حکومت کی بے حقیقتی کا نقش بٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیا، فطرت بشری دوسروں کے عبرتناک انجام سے خاص طور پر متاثر ہوتی ہو، قرآن مجید نے اس آلہ سے پوری طرح کام لیا، اور اقوام گزشتہ و مشاہیر افراد کے جتنے قصے بیان کیے یہ نکتہ ان سب میں ملحوظ رکھا ہو، کہ ان کے سننے اور پڑھنے سے انسان کی مادی خواہشوں اور تمناؤں، حرص و

طمع، کبر و غرور کا زبردست دیو مغلوب ہو، قوم عاد و ثمود، فرعون و نمرود ان سب کے واقعات میں یہ خصوصیت مشترک ہے، مثال کے طور پر ہم صرف ایک حکایت درج کرتے ہیں۔ جو جاہ و دولت، زینت و امارت کے نقش بر آب ہونے کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے، اور جسے بغور پڑھنے کے بعد ممکن نہیں کہ بڑے سے بڑے ہوس پرست کا دل بھی کچھ دیر کے لیے متاثر نہ ہو جائے۔

ان قارون كان من قوم
موسى فبغى عليهم واتينه
من الكنوز ما ان مفاتحه
لتنوء بالعصبة اولى القوة
اذ قال له قومه لا تفرح ان
الله لا يحب الفرحين وابتغ
فيما اتك الله الدار الاخرة
ولا تنس نصيبك من الدنيا
واحسن كما احسن الله اليك
ولا تبغ الفساد فى الارض
ان الله لا يحب المفسدين
قال انما اوتيته على علم عندى
اولم يعلم ان الله قد اهلك
من قبله من القرون من هو
اشد منه قوة واكثر جمعا
ولا يسئل عن ذنوبهم المجرمون

قارون موسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) میں ایک شخص تھا، پھر وہ ان پر ظلم کرنے لگا اور ہم نے اس کو اس قدر خزانے دے رکھے تھے کہ کئی زور آور مرد اس کی کنجیاں بہ مشکل اٹھا سکتے تھے، ایک مرتبہ اس کی قوم (کے بعض لوگوں) نے اس سے کہا کہ اترایا مت کر، خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور یہ جو (ساز و سامان) خدا نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے کچھ آخرت کے گھر کی بھی فکر کرتا رہ (البتہ) دنیا سے جو تیرا حصہ ہے اس کو فراموش نہ کر، اور جس طرح خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو دوسروں کے ساتھ احسان کیا کر اور ملک میں فساد کا خواہاں نہ ہو کہ خدا مفسدوں کو پسند نہیں کرتا، اس نے جواب دیا کہ یہ (جاہ و ثروت) تو مجھ کو اپنی لیاقت سے حاصل ہوئی ہے کیا قارون نے (یہ کہتے وقت) یہ خیال نہ کیا کہ اس

فخرج علی قومه فی زینته
قال الذین یریدون الحیوٰة
الدنیا یلیت لنا مثل ما
اوتی قارون انه لذو حظ
عظیم و قال الذین
اوتوا العلم ویلکم ثواب
الله خیر لمن امن و عمل
صالحا ولا یلقٰها الا الصبرون
فخسفنا به وبداره الارض
فما کان له من فئة
ینصرونه من دون الله
وما کان من المنتصرین
واصبح الذین تمنوا مکانه
بالامس یقولون
ویکان الله یبسط الرزق
لمن یشاء من عباده
ویقدر لولا ان من الله
علینا لخسف بنا ویکانه
لا یفلح الکافرون
(قصص رک ۸)

سے پہلے خدا پچھلی امتوں میں ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے بلحاظ جاہ و حشمت) اس سے کہیں زیادہ قوت رکھتے تھے اور بلحاظ مال بھی اس سے کہیں بڑھے تھے اور گناہ گاروں سے تو اس وقت کے پوچھ کچھ نہیں کی جایا کرتی، اس کے بعد ایک روز قارون اپنی شان و شوکت کے ساتھ اپنی قوم والوں کے سامنے نکلا تو جو لوگ حیات دنیوی کے طلبگار تھے (حسرت سے) کہنے لگے کہ جیسا کچھ ساز و سامان قارون کے پاس ہے اے کاش ہمارے پاس بھی ہوتا اس میں شک نہیں کہ قارون بڑا ہی خوش قسمت ہے (البتہ) جن لوگوں کو خدا کے ہاں سے علم کی دولت دی گئی تھی وہ بولے کہ تمہاری سمجھ پر افسوس جو شخص ایمان لاتا اور عمل نیک کرتا ہے اس کا ثواب قارون کے مال و دولت سے کہیں بڑھ کر ہے مگر وہ ثواب بجز صبر کرنے والوں کے اور کسی کو نہیں ملتا پھر ہم نے قارون اور اس کی کوٹھی کو زمین میں دھنسا دیا اس وقت کوئی جماعت اس کی مدد کو نہ اٹھی اور نہ وہ خود اپنے تئیں بچا سکا اور جو لوگ کل شام تک اس کی جگہ ہونے کی آرزو کرتے تھے وہ آج صبح کہنے لگے کہ ارے غضب خدا ہی اپنے بندوں میں جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے

محفوظ کر دیتا ہو اور اس کا کرم اگر ہم پر نہ ہوتا تو ہم کو
بھی وہ قارون کی طرح دھنسا دیتا ارے غضب
بات یہ ہو کہ ناشکروں کو فلاح نصیب نہیں ہوتی،

اس قسم کے عبرت انگیز حکایات و قصص کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہی ہو کہ مسلمانوں کے دلوں پر مال و ثروت کی بے حقیقتی کا گہرا نقش ثبت ہو، اور مادی شان و شوکت کی طرف سے ان کی طبیعت از خود ہٹ جائے۔

ایک مسلمان کو اپنے مخالفین کے ساتھ کیونکر پیش آنا چاہیے. عام دنیا کے ساتھ اس کا کیا سلوک رہنا چاہیے، اور اگر اغیار اس کے مذہب و معتقدات پر اعتراض کریں تو ان کے مقابلہ میں اسے اپنا کیا طرز عمل رکھنا چاہیے، قرآن نے ان میں سے ہر سوال کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا ہو، عفو و درگذر، حلم و تحمل اور احسان عام کا اس نے بار بار حکم دیا ہو، صرف مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ کل دنیا کے مقابلہ میں جس میں کفار بھی شامل ہیں. ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ

قولوا للناس حسنا بقرک ۱ — لوگوں سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ

یہ نہیں کہا کہ صرف مسلمانوں سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ۔

ایک مقام پر جہاں نیک کار و فلاح یافتہ بندوں کے خصائل بیان کئے ہیں وہاں یہ ہے کہ

والکاظمین الغیظ	وہ لوگ ہیں جو غصہ کو ضبط کرتے ہیں
والعافین عن الناس	اور لوگوں کے قصور سے درگزر کرتے
واللہ یحب المحسنین	ہیں اور خدا احسان کرنے والوں کو
(آل عمران رک ۱۴)	دوست رکھتا ہے۔

یہاں بھی عفو و احسان کی ہدایت عام ہے، مومن و کافر کی کوئی تفریق نہیں
نیک کاروں کی شناخت یہ بتائی گئی، کہ

ویدرؤن بالحسنة السئیة (قصص رک) — وہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیتے ہیں

اور جب بُروں سے سابقہ پڑ جاتا ہے، تو بکمالِ حلم و رواداری ان سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں،

واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنہ و قالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم (قصص رک ۶) — وہ جب لغویات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور ان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے اور تمھارے اعمال تمھارے ساتھ۔

برائی کے جواب میں نرمی کرنا چاہیے

ادفع بالتی ھی احسن السئیة (مومنون رک) — برائی کو نرمی کے ساتھ دور کرو۔

خود سرور کائنات صلعم کو ہدایت ہے کہ،

خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاھلین، (اعراف رک ۲۴) — عفو کی عادت اختیار کرو اور نیکی کی تلقین کرتے رہو اور جاہلوں سے سابقہ پڑے تو کنارہ کش ہو جاؤ

اہل کتاب سے مقابلہ کے وقت ہمیشہ بہ لطف و آشتی پیش آتے رہنا چاہیے۔

ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن (عنکبوت رک ۵) — اہل کتاب کے ساتھ جھگڑا مت کرو، مگر اس صورت سے جو عمدہ و شائستہ ہو،

نیکوں کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے، کہ

اذا ما غضبوا ھم یغفرون (شوریٰ رک) — جب ان کو غصہ آجاتا ہے تو درگزر سے کام لیتے ہیں

یہاں بھی یہ قید نہیں لگائی گئی ہے کہ صرف مسلمانوں ہی کے مقابلہ میں درگزر سے کام لیتے ہیں۔

تبلیغ دعوت کے وقت رسول اللہ صلعم کو یاد دلایا جاتا ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (نحل رک ۱۶)

لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف بلاؤ حکمت اور نیک نصائح کے ذریعہ سے، اور اگر بحث کرو تو شایستہ و پسندیدہ طریقہ سے،

برگزیدہ و مقبول خدا بندوں کی بڑی پہچان یہ ہوتی ہے کہ،

یمشون علی الارض ھوناً واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما (فرقان رک ۶)

وہ زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے جہالت کی باتیں کرنے لگتے ہیں تو وہ سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔

خالق ذوالجلال نے خود اپنی شان یہ بتائی ہے کہ

ورحمتی وسعت کل شیئ (اعراف رک ۱۹) میری رحمت ہر شے پر محیط ہے،

یہ نہیں فرمایا کہ میری رحمت فلاں فرقہ کے ساتھ مخصوص و محدود ہے، اور چونکہ وہ خود رحمت مطلق ہے، اس لیے دنیا کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے، کہ

ان الحسنات یذھبن السیئات (ھود رک ۱) خوبیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں

بالفاظ دیگر اپنے ابنائے جنس کے نقائص و عیوب کے بجائے ان کی خوبیوں پر نظر رکھو اپنے حبیب و محبوب پیمبر اسلام کا وصف کیا بیان کیا؟ رحمۃ للعالمین کی یہاں بھی وہی شان اطلاق و ہمہ گیری ہے، سارے عالم کے لیے رحمت، محض ایک گروہ کے لیے رحمت نہیں۔

فرعون سے بڑھ کر عصیان و طغیان کا مجسمہ دنیا میں اور کون گذرا ہے جس نے انکار خداہی پر اکتفا نہ کی بلکہ خود مدعی الوہیت ہو گیا، اور جیسے کچھ مظالم اپنی غریب رعایا پر کیے ان کے رعشہ انگیز تذکروں سے قرآن لبریز ہے۔ اس پر بھی جب موسیٰؑ و ہارونؑ اس کی فہمائش کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت ہوتی ہے کہ

وقولا له قولا لینا (طٰہٰ رک ۲) اس سے گفتگو میں نرمی کرنا۔

غور کرو، یہ ارشاد فرعون سے متعلق ہے پھر آج کیا دنیا کا بدترین انسان بھی فرعون سے زیادہ سختی کا مستحق ہو سکتا ہے،

حضرت مسیح کو جتنی تکلیف ان کی امت نے دی، اس سے زیادہ اذیت کون امت کسی نبی کو پہنچا سکتی ہے، انتہا یہ ہے کہ خدا کے ساتھ ان کی پرستش شروع کر دی، بایں ہمہ جب قیامت میں ان باطل پرستوں سے مواخذہ ہونے لگے گا، تو حضرت مسیحؑ عذاب کی سفارش نہ کریں گے بلکہ عرض کریں گے کہ

ان تعذبھم فانھم عبادک و ان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم (مائدہ رک ۱۶) اگر تو ان پر عذاب کرنا چاہے تو یہ تیرے بندے ہیں (تجھے اختیار ہے) اور اگر بخش دینا چاہے تو تو ہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

کفار و مشرکین سے گفتگو کے وقت اس کی تاکید آئی ہے کہ ان کے مقابلہ میں درشتی سے نہ کام لیا جائے ورنہ وہ بھی بدزبانی سے کام لیں گے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (انعام رک ۱۳) جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو بلاتے ہیں ان کو برا نہ کہو، ورنہ وہ بھی اپنی نادانی سے ناحق خدا کو برا کہہ اٹھیں گے،

پھر یہ بھی ممکن ہے، کہ انسان جس کسی کو گمراہ، بدعقیدہ، بداعمال سمجھتا ہے اس کی بابت زبان سے تو کچھ نہ کہے تاہم دل میں اس کے متعلق سخت ترین مخالفانہ و دشمنانہ جذبات رکھے، خدائے اسلام کی حکمت کاملہ نے سرے سے اس تخیل ہی کی جڑ کاٹ دی ہے، قرآن میں بار بار تصریح آتی ہے کہ ہدایت و ضلالت کا فیصلہ کرنے والے تم نہیں ہم ہیں، یہ کہنے کا حق کہ فلاں شخص گمراہ ہے، علام الغیوب و دانندۂ اسرار ہی کو ہے۔ بندوں کو نہیں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

ان ربکم هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین (قلم - ع ۱)

تمھارا پروردگار اس کو خوب جانتا ہے کہ گمراہ کون ہے اور راہ حق پر کون کون ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا،

ان ربک هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بمن اهتدیٰ (نجم ع ۲)

اس کا علم تمھارے پروردگار کو ہے کہ راہِ ضلالت پر کون ہے اور راہ حق پر کون۔

ایک اور مقام پر تصریح ہے۔

قل کل یعمل علیٰ شاکلته فربکم اعلم بمن هو اهدیٰ سبیلا (بنی اسرائیل ع ۹)

کہدو کہ ہر شخص اپنے اپنے طور پر عمل کرتا ہے اور اس کا علم تمھارے پروردگار ہی کو ہے کہ راہِ راست پر کون ہے۔

ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ حلم و تحمل، عفو و درگزر، رافت و رحمت کی تعلیم اور شورش اور فساد، تعلی وخود بینی، منافرت و بدامنی کے جذبات کو مٹانے میں قرآن نے کسی دوسری مذہبی کتاب سے کچھ بھی کم حصہ لیا ہے۔

یہاں تک جو کچھ اسلام کی تعلیمات درج کی گئیں وہ براہ راست قرآن مجید کے احکام تھے اس لیے کہ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کا اتباع مسلمانوں کی ہر جماعت و ہر فرد، خواہ وہ برائے نام ہی مسلمان ہو، اپنے اوپر فرض سمجھتی ہے، مطالب بالا کی توضیح و تائید میں اب چند احادیث بھی درج کی جاتی ہیں جن سے صاف نظر آجائے گا کہ جن بدنصیبوں نے رحمت عالم ؐ کو نعوذ باللہ خونخواری و سفاکی کا لباس پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے انھوں نے دیانت اور راست گوئی کا کس قدر خون کیا ہے۔

سب وشتم و بدزبانی کی ممانعت

(۱) عن ابن مسعود، قال قال رسول اللہ صلعم لیس المومن بطعان ولا فاحش ولا ھذی۔ (ترمذی)

ابن مسعود سے روایت ہو کہ رسول خدا نے فرمایا کہ طعن کرنے والا۔ فحش بکنے والا اور بدزبانی کرنے والا شخص کامل مومن نہیں،

(۲) عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلعم لا یکون اللعانون شفعاء یوم القیمۃ ولا شہداء (مسلم)

ابو درداء سے روایت ہو کہ رسول خدا نے فرمایا کہ جو لوگ لعنت کرتے رہتے ہیں ان کی شہادت و شفاعت قیامت میں مقبول نہ ہوگی۔

(۳) عن ابو ھریرۃ قال قیل یارسول اللہ ادع اللہ علی المشرکین والعنھم فقال انما بعثت رحمۃ ولم ابعث لعانا (مسلم)

ابو ہریرہ رضی سے روایت ہو کہ کسی شخص نے آنحضرت صلعم سے عرض کی کہ مشرکوں کے لیے بددعا کیجیے اور لعنت بھیجیے، آپ نے جواب دیا کہ میں تو صرف رحمت کے لیے بھیجا گیا ہوں نہ اس لیے کہ لوگوں کو بددعا اور لعنت کروں۔

یہ آخری حدیث خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہو جس میں تصریح موجود ہے کہ رحمت عالم نے اپنی رحمت کی وسیع دامانی سے مشرکین تک کو محروم نہیں رکھا ہو۔

حلم و تحمل

(۱) عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلعم ما تعدون الصرعۃ فیکم قالوا الذی لا تصرعہ الرجال قال لا ولکنہ الذی یملک نفسہ

ابن مسعود رضی سے روایت ہو کہ آنحضرت نے فرمایا کہ تم پہلوان کس کو قرار دیتے ہو اصحاب نے کہا وہ جس کو دوسرے اشخاص نہ پچھاڑ سکیں آپ نے فرمایا نہیں بلکہ پہلوان وہ ہی جو غصہ کے

عند الغضب (مسلم)

وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔

عن ابی هریرة ان رجلا قال یا رسول الله صلعم اوصینی ولا تکثر علیّ لعلی لا اعی قال لا تغضب (بخاری)

ابو ہریرہ رضی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر آنحضرت صلعم سے عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے مگر زیادہ نہ فرمائیے گا کہ میں بھول جاؤں گا، آپ نے فرمایا کہ غصہ نہ کیا کر

نرمی و رحمدلی

عن عائشة عن النبی صلعم قال ان الله رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف وما لا یعطی علی ما سواه (مسلم)

حضرت عائشہ رضی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اللہ نرم ہے اس لیے نرمی کو پسند کرتا ہے اور جو کچھ نرمی پر دیتا ہے وہ سختی پر نہیں دیتا نہ اس کے علاوہ اور کسی شے پر دیتا ہے۔

عن عبد الله بن عمرو قال سمعت رسول الله یقول الراحمون یرحمهم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (ابوداؤد)

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ رحم والوں پر خدائے رحمن رحم کرتا ہے پس زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

عن اسامه بن زید عن رسول الله صلعم انما یرحم الله من عباده الرحماء (بخاری)

اسامہ رضی بن زید سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اللہ اپنے بندوں میں انھیں پر رحم کرتا ہے جو رحمدل ہیں۔

احادیث بالا میں تم نے یہ قید نہیں پائی کہ نرمی اور رحمدلی کا دائرہ صرف اپنے ہم مذہبوں تک محدود رکھنا چاہیے۔

عفو و درگزر

عن[۱] انس عن رسول اللہ صلعم انه قال افضل الفضائل ان تصل من قطعک و تعطی من منعک و تصفح من شتمک۔

انس رض سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اس سے رشتہ محبت جوڑو جو اسے قطع کرے۔ اس کو عطا کرو جو تمہیں عطا نہ کرے اور اسے معاف کرو جو تمہیں گالی دے۔

عن[۲] حذیفه قال قال رسول اللہ صلعم لا تکونوا امعة تقولون ان احسن الناس احسننا وان ظلموا ظلمنا ولکن وطنوا انفسکم ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساؤ فلا تظلموا

(ترمذی)

حذیفہ رض سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ انتقام پسند ہو کر یہ نہ کہو کہ جو ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے ہم ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور جو ہمارے ساتھ ظلم کریں گے ہم ان کے ساتھ ظلم کریں گے بلکہ اپنے نفوس کو اسکا خوگر کرو کہ اگر دوسرے اچھائی کریں تو تم بھی اچھائی کرو اور اگر وہ برائی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔

مثال کے طور پر ان چند حدیثوں پر اکتفا کیا گیا ورنہ کتب حدیث اس قسم کے ارشادات سے لبریز ہیں جو سرتا سر درس حلم و عفو ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد احادیث ایسی بھی منقول ہیں جن میں انسان سے گزر کر حیوانات تک پر شفقت رکھنے کی تاکید آئی ہے، اور ان پر سختی اور تشدد کو معصیت قرار دیا گیا ہے۔

جس شریعت کی یہ تعلیمات ہوں، جس مذہب کے یہ احکام ہوں اور جس نبی برحق کے یہ ارشادات ہوں کس کو اس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ اس شریعت کا وجود دنیا کے لیے پیام امن، اس مذہب کا حدوث عالم کے لیے مایۂ برکت اور اس نبی صلعم کا ظہور کائنات کے لیے آیۂ رحمت ہے۔

——— ⁂ ———

باب (۷)

اسلام اور صبر

امتدادِ زمانہ صورت موجودات کو اکثر اس درجہ مسخ کر دیتا ہی کہ غیر تو کیا خود اپنے تئیں شناخت کرنا دشوار ہو جاتا ہی، انسان جوان ہو کر جب اپنے زمانۂ شیر خوارگی کی تصویر دیکھتا ہی تو اپنے ماضی و حال کے درمیان کوئی مناسبت پاتا ہی؟ ایک ہشتاد سالہ پیرزال جب اپنے چہرہ کی جھریوں کا عکس آئینہ میں دیکھتی ہی تو اسے یہ باور کرنا کس قدر دشوار ہو جاتا ہی کہ یہی چہرہ ایک زمانہ میں رونق و تازگی، حسن و بہار، زیبائی و دلکشی کا نگار خانہ تھا؟ ایک کہنہ مشق شاعر جب اپنی نوعمری کا کلام دیکھتا ہی تو مشکل سے اسے اپنا یقین کرتا ہی،

یہی حال اقوام کا ہی، یونان کی آج جو دماغی سطح ہی، اس کے لحاظ سے کیونکر یقین ہو سکتا ہی کہ ہومر، سوفوکلیز، بقراط و جالینوس، سقراط و فیثاغورث، افلاطون و ارسطو اسی سرزمین سے اٹھے تھے۔ ایران کی موجودہ سیاسی پستی و انحطاط کو دیکھ کر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ آ سکتا ہی کہ خسرو و قباد، دارا و جم، اسی خاک کی پیداوار تھے؟ جاپان کو اس وقت حصول جاہ و حشم و اکتساب ثروت و امارت میں جو انہماک ہے،

اسے گوتم بدھ کی تعلیم ترکِ دنیا و تزکیۂ نفس سے کوئی بعید سے بعید بھی مناسبت ہی۔

تغیر و انقلاب کے اس عالمگیر قانون سے دنیائے اسلام بھی مستثنیٰ نہیں، اگر کسی طریقہ سے پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں کو چودھویں صدی ہجری کے مسلمانوں کے پہلو میں لاکھڑا کرنا ممکن ہو، تو اوضاع و اطوار، اعمال و کردار، مراسم و شعائر، احساسات و عقائد، غرض ہر حیثیت سے آسمان و زمین کا فرق نظر آئے گا، یہاں تک کہ بعض ایسے عناصر جنہیں اسلام کی روح کہنا چاہیے، ان سے موجودہ مسلمان یکسر خالی نظر آئیں گے۔

آج اگر کسی غیر مذہب و اقوام کے شخص سے سوال کیا جائے، کہ ایک مسلمان کا اس کے ذہن میں کیا تصور ہی تو اس کے پاس صرف دو ہی جوابات ہوں گے یا تو وہ یہ کہے گا کہ مسلمان ایک وجود ہے جس کا نام ہی، جمود و تعطل کا مجسمہ ہی، جس میں کسی طرح کی حمیت، غیرت و خودداری کا وجود نہیں، اور جو ہر وقت ادنیٰ معاوضہ پر اپنی عزتِ نفس کے فروخت کرنے پر آمادہ رہتا ہی، اور یا پھر وہ یہ کہے گا کہ مسلمان ایک شعلۂ آتشین کا نام ہی، جس کا مشغلہ جدال و قتال ہی، اور جو دوسروں سے تعصب و عناد، نفرت و عداوت رکھنا اپنی سب سے بڑی عبادت سمجھتا ہی، گویا اغیار کے نزدیک ہر مسلمان اگر وہ محمد شاہ (رنگیلے) یا واجد علی شاہ کا ہم رنگ نہیں، تو اپنی جگہ پر چنگیز یا ہلاکو ہی۔

لیکن حقیقت یہ ہی کہ اسلام نے اپنے پیرؤں کو ان دونوں صورتوں سے بالکل ہی الگ رہنے کی ہدایت کی ہی۔ ان میں سے شقِ اول پر گفتگو کرنا اور یہ دکھانا کہ اسلام تمام تر خودداری و غیرتمندی کی ایک دعوت ہی، ہمارے موجودہ موضوعِ بیان سے خارج ہی، البتہ دیکھنے کی بات یہ ہی، کہ شقِ آخر الذکر کے متعلق اسلام کی کیا تصریحات ہیں عام حلم و لینت، عفو و درگزر، اور حسن سلوک کی بابت اسلام کی جو تعلیمات

ہیں ان کا ذکر باب گزشتہ میں آچکا ہے، لیکن اگر ایک ظالم حکمراں ہم پر شدائد کر رہا ہے، ایک بدکار شخص ہماری ایذا کے درپے ہے، ایک دشمن ہماری جان و مال پر حملہ کر رہا ہے اس وقت اسلام کس طرز عمل کی ہدایت کرتا ہے ایسے مواقع کے لیے اسلام کے احکام کیا ہیں۔

ان سوالات کے جواب میں اسلام نے ایک مختصر و جامع لفظ ارشاد فرمایا ہے اور وہ مختصر لفظ صبر ہے، قرآن بہ تاکید اپنے ماننے والوں کو صبر کا حکم دیتا ہے،

واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ (بقر رکوع ۵) صبر و نماز سے مدد چاہو۔

خود صبر کرتے رہو اور دوسروں کو صبر کی تعلیم دو،

یا ایہا الذین آمنوا اصبروا وصابروا (آل عمران رکوع ۲)	اے ایمان لانے والو صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی ہدایت کرتے رہو،

خدا انھیں لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو صبر کرتے ہیں۔

یا ایہا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین (بقر۔ ۱۹)	اے ایمان والو صبر و نماز سے مدد چاہو کیونکہ خدا صبر کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے۔
واللہ یحب الصابرین (آل عمران رکوع ۱۵)	خدا صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

فلاح و ہدایت پانے والے وہی لوگ ہیں، جو صبر سے کام لیتے ہیں،

وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولٰئک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واولٰئک ھم المھتدون (بقر رکوع ۱۹)	اے پیمبر! صابرین کو خوشخبری سنا دو، جو مصیبت کے وقت کہتے ہیں کہ ہم تو خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی عنایت و رحمت ہے اور یہی راہ ہدایت پر ہیں۔

نیک لوگوں کی پہچان یہ ہو کہ وہ

والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس (بقرہ رک ۲۲) — مصیبت و تکلیف اور خوف کے وقت صبر کرنے والے ہیں

صبر کرنے والوں کے لیے اجر بے حساب ہے۔

انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب — وہ صبر کرنے والے ہی ہیں جنھیں بے حساب اجر ملے گا۔

دشمنوں کے مکائد سے محفوظ رکھنے والی شے صبر ہی ہے

وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا (آل عمران رک ۱۲) — مسلمانوں اگر تم ان (دشمنوں) کی ایذاؤں پر صبر سے کام لیتے رہو اور زیادتی سے بچے رہو تو ان کا فریب تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

مخالفین کی ایذا رسانی سے طبعاً تکلیف ہوتی ہے، لیکن اس پر صبر کرنا بڑی ہمت و مرتبہ کا کام ہے،

ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذی کثیرا وان تصبروا وتتقوا فان ذلک من عزم الامور (آل عمران رک ۱۹) — اے مسلمانوں، تم اہل کتاب و مشرکین سے ضرور ایذا کی باتیں بھی بہت سی سنوگے، لیکن اگر صبر و پرہیزگاری سے کام لیتے رہو تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ایک دوسری جگہ ہے،

واصبر علی ما اصابک ان ذلک من عزم الامور (لقمان رک ۲) — مصائب پر صبر کر، کہ صبر کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

صبر کا انعام اسی مادی زندگی ہی میں مل جاتا ہو اور جو لوگ مظالم پر صبر کرتے رہتے ہیں بالآخر وہی ظالموں کے ملک و مال پر حاکم ہو جاتے ہیں۔

واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض و مغاربها التی بارکنا فیھا وتمت کلمت ربک الحسنیٰ علی بنی اسرائیل بما صبروا (اعراف رک ۱۶)

جس زمین کو (زرخیزی) کی برکت ہم نے دی تھی بالآخر اس کے شرق و غرب کا مالک ہم نے اس قوم کو کردیا جو (ظالم فرعون کے ہاں) کمزور سمجھی جاتی تھی اور پروردگار کا وعدہ نیک اس قوم کے حق میں پورا ہوکر رہا۔ اس لیے کہ اس نے (مظالم پر) صبر سے کام لیا تھا۔

صبر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ دشمنی کو دوستی سے بدل دیتا ہے۔ انسان اگر کچھ عرصہ تک صبر سے کام لے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے کرتا رہے تو دشمن دوست بن جائیں گے البتہ صبر سے کام لیتے رہنا بڑے درجہ کے لوگوں کا کام ہے۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقٰھا الا الذین صبروا وما یلقٰھا الا ذوحظ عظیم (حم السجدہ۔ ع ۵)

برائی کا بدلہ بھلائی سے کرو، تو تم دیکھو گے کہ تم سے جس شخص سے عداوت تھی وہ اب تمہارا دلسوز دوست بن گیا ہے۔ یہ حسن مدارات کی توفیق تو انہیں لوگوں کو دی جاتی ہے، جو صبر سے کام لیتے رہتے ہیں اور جن کے بڑے نصیب ہیں۔

فرعون کے جبر و ظلم کی مثال دنیا آج پیدا نہیں کر سکتی، اس نے بالکل بلا قصور بے سبب اولادِ اسرائیل کے قتل عام کا حکم دیدیا تھا، با این ہمہ ایسے موقع پر بھی حضرت موسیٰ نے اس کے خلاف بغاوت نہیں کی، اس سے جدال و قتال کے لیے علم جہاد نہیں بلند کیا۔ بلکہ

قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین اعراف رک ۱۵)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد مانگو اور صبر سے کام لیتے رہو یہ ملک تو سب اللہ ہی کا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام بخیر تو پرہیزگاروں ہی کا ہے،

صبر سے کام لینا پیمبروں کا وصف رہا ہے

واسمٰعیل وادریس وذاالکفل، کل من الصابرین (انبیاء رک ۶)

اسمٰعیل، اور ادریس، و ذوالکفل یہ سب کے سب صابر بندوں میں سے ہیں۔

پیمبروں نے خود اپنی زبان سے اپنے اسی جوہر ممتاز کو پیش کیا ہے۔

ولنصبرن علیٰ ما اذیتمونا وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون (ابراہیم رک ۲)

(پیمبروں کو جب بہت زیادہ ستایا گیا تو انہوں نے اپنی امتوں سے کہا، اب تک جیسی جیسی ایذائیں تو ہم کو پہنچاتے رہے ہو ہم نے ان پر صبر کیا اور آئندہ بھی ضرور ان پر صبر کرتے رہیں گے اور توکل کرنے والوں کو خدا پر توکل رکھنا ہی چاہیے۔

حضرت ایوب نے انتہائے صبر سے کام لیا، تو ان کی خاص مدح آئی، کہ

انا وجدناہ صابرا نعم العبد (ص رک ۳) ہم نے ان کو بڑا صابر پایا! اور وہ کیا ہی اچھے بندے تھے

حضرت یوسف کو باوجود ظاہری سامان کے فقدان کے جو مرتبہ حاصل ہوا، وہ ان کے صبر کی وجہ سے ملا چنانچہ جب ان کے بھائیوں کو تنبہ ہوا کہ وہ یوسف کے سامنے ہیں تو آپ نے فرمایا،

قال انا یوسف وھذا اخی قد من اللہ علینا انہ من یتق ویصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (یوسف رک ۱۰)

کہا ہاں میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی (ابن یامین) ہے ہم پر خدا نے بڑا فضل کیا اور جو کوئی خدا سے ڈرتا اور مصائب پر صبر کرتا ہے تو خدا نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

صبر مجبوری کے مرادف نہیں، صبر کی تعریف یہ ہو کہ ظالم سے انتقام لینے کی قوت ہو پھر بھی انتقام نہ لیا جائے، حضرت داؤد کا صبر اسی قسم کا تھا، کہ باوصف اس کے کہ اتنی بڑی عظیم الشان سلطنت کے مالک تھے اور طیور و جمادات تک پر ان کی حکومت قائم تھی

پھر بھی کفار کے مقابلہ میں بجائے اپنی قوت کے استعمال کے ضبط وتحمل سے کام لیتے تھے پیمبر اسلام صلعم کو ان کی نظیر پر خاص طور پر توجہ دلائی گئی ۔

اصبر علی ما یقولون واذکر عبدنا داؤد ذا الاید ... ... (ص، رک ۲)

اے پیمبر جیسی جیسی باتیں یہ لوگ کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو باوجودیکہ ہر طرح قدرت رکھتے تھے ۔

ابتدائے ظہور اسلام میں کفار نے ایذا رسانی کے جو طریقے اختیار کیے تھے ان کے تذکروں سے تاریخ اسلام لبریز ہے۔ ان پیہم شدائد پر پائے ضبط و قرار کو لغزش ہو جانا بالکل مقتضائے بشریت تھا، ان انتہائی مواقع پر بار بار اور تکرار کے ساتھ صبر کی تاکید ہوتی رہی مثلاً

فاصبر علی ما یقولون (طٰہٰ، رک ۸)

اے پیمبر جیسی جیسی باتیں یہ کافر کہتے ہیں ان پر صبر کرو

واصبر علی ما یقولون واهجرهم هجرا جمیلا (مزمل، رک ۲)

ان کی باتوں پر صبر کرو اور ایک حسن اسلوب کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو،

واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیهم ولا تک فی ضیق مما یمکرون، ان اللہ مع الذین اتقوا والذین هم محسنون (نحل، رک ۱۶)

اے پیغمبر، مخالفین کی ایذا پر صبر سے کام لو، جو بغیر توفیق الٰہی کے نہیں ہو سکتا ان لوگوں کی حالت پر غم نہ کرو اور جو چالیں یہ لوگ تمہاری مخالفت میں سوچتے ہیں ان سے تنگدل نہ ہو کیونکہ جو لوگ پرہیزگار ہیں اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے رہتے ہیں خدا ان کا ساتھی ہے۔

اخلاقی حیثیت سے نہایت نازک موقع وہ ہوتا ہے جب وہ مختلف فرائض میں آکر تصادم واقع ہو جاتا ہے اور فرض شناسی انسان کو متضاد سمتوں میں کھینچتی ہے، مثلاً ایک طرف والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت کے لیے قرآن میں جا بجا سخت تاکید آئی ہے،

لیکن دوسری طرف اسلام نے شرک کو ایسا گناہ قرار دیا ہی، جو کسی حالت میں بھی قابل معافی نہیں، اور جس کے مقابلہ میں تمام دیگر معاصی ہیچ ہیں، اب فرض کرو والدین مشرک ہیں اور وہ اولاد کو اپنے عقیدہ کا پابند بنانا چاہتے ہیں ایسی صورت میں اولاد کا کیا فرض ہونا چاہیے؟ ان کے فرمان کے آگے گردن ڈالدے ہیا ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرے؟ اسلام نے ان دونوں صورتوں کو رد کر کے ایک تیسری صورت پیش کی ہی جس سے زیادہ تر قرین عدل و اعتدال کوئی اور راستہ ممکن ہی نہیں یعنی اس باب خاص میں ہرگز ان کی تعمیل ارشاد نہ کی جائے. باین ہمہ تمام دوسری باتوں میں ان کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیے قرآن کے الفاظ بالکل واضح ہیں

ووصينا الانسان بوالديه حسنا
وان جاهداك لتشرك بي ما ليس
لك به علم فلا تطعهما
(عنکبوت رکوع ۱)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا لیکن اگر وہ اس کے درپے ہوں کہ تو کسی کو ہمارا شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو (اس ایک بات میں) انکا کہنا نہ ماننا

دوسری جگہ اس سے زائد توضیح ہے،

ووصينا الانسان بوالديه حملته امه
وهنا على وهن وفصاله في عامين
ان اشكرلي ولوالديك الى
المصير وان جاهداك على
ان تشرك بي ما ليس لك به
علم فلا تطعهما وصاحبهما في
الدنيا معروفا

ہم نے انسان کو اس کے والدین کے حق میں تاکید کی (کہ ہر حال میں انکا ادب ملحوظ رکھے) اسکو ماں نے جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس تک اسکی رضاعت کی پس ہم نے حکم دیا کہ ہمارا بھی شکر گزار رہ اور اپنے والدین کا بھی کہ آخر کار ہماری ہی طرف سب کو واپس آنا ہی لیکن اگر تیرے والدین تجھکو مجبور کریں کہ تو ہمارے ساتھ کسی کو شریک

بنالے جس کے لیے تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس بات (لقمٰن رک ۲)
میں تو ان کا کہنا نہ ماننا لیکن دنیا میں سعادت مندانہ
سلوک کیے جانا۔

غور کرو شرک سے بڑھ کر اسلام کی نظر میں قابل نفرت شے اور کون ہو سکتی ہے؟ اس
پر بھی اگر والدین اس کے لیے مجبور کرتے ہیں، تو ان کے خلاف اعلان جنگ کر دینے کا حکم
نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ گو اپنے عقیدہ پر استحکام و استقامت کے ساتھ قائم رہنا، والدین
کے کہنے میں آ کر اپنے ایمان میں لغزش نہ پیدا کرنا، تاہم ان سے لڑنے نہ لگنا، بلکہ ان کے ساتھ حسن
سلوک اور رفق و مدارات برابر جاری رکھنا، جب یہ حکم شرک سے متعلق ہے تو اس سے کم
درجہ کے معاصی کی بابت اسلام کی رواداری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کہہ سکتے ہو کہ والدین و اولاد کے باہمی تعلقات کی ایک استثنائی صورت ہے،
اتنی رواداری ہر شخص کے مقابلہ میں نہیں برتی جا سکتی، لیکن چند سطریں اوپر صبر و تحمل
سے متعلق جو کثیر التعداد آیات قرآنی نقل کی گئیں، ان سب میں صبر و تحمل کی تعلیم، عام
کفار و مشرکین ہی کے مقابلہ میں ہے، انھیں برابر ذہن میں محفوظ رکھنا چاہیے۔

پیمبروں کو ان کی امتوں نے کیسی کیسی شدید ایذائیں پہنچائیں، لیکن قرآن انکے
مقابلہ میں اس حضرات کے ضبط و تحمل کی کس قدر داد دیتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام
کو جب لوگوں نے بہت ستایا اور انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو یہ نہیں کہا کہ میرے
مخالفین سب غارت و ہلاک کر دیے جائیں، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ

فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی — جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میری
فانک غفور رحیم (ابراہیم رک ۶) — نافرمانی کی تو اے خدا تو بخشنے والا مہربان ہے،

یہ ابراہیم کون؟ وہ جن کی ملت ابراہیمی کا دوسرا نام اسلام ہے، جن کے حسن عمل پر
قرآن نے سب پیمبروں سے زیادہ توجہ دلائی ہے اور جن کے طرز عمل کو قرآن نے

اپنے پیرووں کے سامنے تصریح کے ساتھ بطور "اسوۂ حسنہ" کے پیش کیا ہے۔

یہی طرزِ عمل رافت مجسم حضرت مسیح کا بھی تھا، یہاں تک کہ جب ان سے ان کی اُمت کی تثلیث پرستی کی بابت سوال ہوگا، تو اس وقت بھی ان کی زبان سے بجائے کلمات غیظ و غضب کے یہ الفاظ نکلیں گے،

ان تعذبھم فانھم عبادک وان
تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم ٥
(مائدہ رکوع ۱۶)

اگر تو انہیں عذاب دینا چاہتا ہے تو یہ تیرے ہی
بندے ہیں (تجھے اختیار ہے) اور اگر انہیں بخشنا
چاہتا ہے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

سب سے آخری بحث یہ ہے کہ باوجود انتہائی ضبط و تحمل، صبر و عفو سے کام لینے کے بھی اگر کوئی شخص ناحق ہماری ایذا رسانی کے نہیں بلکہ سرے سے ہماری جان ہی لینے کے درپے ہے تو ایسی صورت میں دینِ حق کا کیا فتویٰ ہے؟ ایک شخص بالکل بلا قصور ہمارے قتل کرنے کو تلوار اٹھا رہا ہے، ہم گردن ڈالے دیتے ہیں، اس سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتا، بلکہ وار کر ہی رہا ہے اس آخری صورت میں تو یقیناً چارہ کار یہی ہوگا کہ ہم بھی حفاظت خود اختیاری کا کام قبضۂ شمشیر سے لیں؟ لیکن دیکھو خود پروردگارِ عالم کے ہاں سے کیا فرمان صادر ہوتا ہے۔

واتل علیھم نبا ابنی آدم بالحق
اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم
یتقبل من الاخر قال لاقتلنک قال انما
یتقبل اللہ من المتقین لئن بسطت
الی یدک لتقتلنی ما انا بباسط یدی
الیک لاقتلک انی اخاف اللہ رب
العالمین انی ارید ان تبوء باثمی و
اثمک فتکون من اصحاب النار و

اے پیغمبر ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کے واقعی حالات
پڑھ کر سنا دو کہ جب دونوں نے نیازیں چڑھائیں تو
ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی تو وہ
(مارے حسد کے) کہنے لگا کہ میں تجھ کو قتل کر ڈالوں گا۔ اس
نے جواب دیا کہ خدا تو صرف پرہیزگاروں کی نیاز قبول کرتا ہے
اور اگر میرے قتل کے لئے تو ہاتھ چلائے گا تو میں تجھے
قتل کرنے کے لیے تجھ پر ہاتھ چلانے والا نہیں کیونکہ میں
خدائے پروردگارِ عالم سے ڈرتا ہوں، میں تو یہ چاہتا ہوں، کہ

ذٰلک جزاؤا الظالمین فطوعت له نفسه قتل اخیه فقتله فاصبح من الخاسرین
(مائدہ ۵ رکوع ۵)

تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹے اور دوزخیوں میں جا شامل ہو کہ ظالموں کی یہی سزا ہے اس پر اس حاسد بھائی (قابیل) کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کیا چنانچہ آخرکار اس نے قتل کر ہی ڈالا اور آپ ہی گھاٹے میں آ گیا۔

خیال کرو، قتل ناحق کی اس سے بڑھ کر مثال دنیا اور کیا پیش کر سکتی ہے، دو برابر کے بھائی ہیں، دونوں نذریں چڑھاتے ہیں، ایک کی قبول ہو جاتی ہے، دوسرے کی نہیں قبول ہوتی بدکار بھائی حسد سے بیخود ہو کر نیک کار بھائی کو قتل کر ڈالنا چاہتا ہے، وہ بیچارہ چوں تک نہیں کرتا، بلکہ صاف کہہ دیتا ہے کہ تمھیں ہاتھ چلانے کا اختیار ہے لیکن میں حفاظت خود اختیاری میں بھی ہاتھ نہیں اٹھانے کا۔ شقاوت مجسم بھائی کی آتش غضب اس غیر معمولی حلم سے بھی نہیں سرد ہوتی ہے اور وہ قتل کر ہی ڈالتا ہے، سعادت مجسم بھائی بلا تامل مقتول و مظلوم بننا گوارا کر لیتا ہے، لیکن مدافعۃً بھی اپنی انگلی نہیں ہلاتا بلکہ اس کا انصاف عادل حقیقی کے سپرد کرتا ہے۔ ؎

؎ اس آیت قرآنی کے ذیل میں ایک حدیث بھی نظر سے گزری ہے، جو دنیا کی موجودہ صورت واقعات سے اس قدر مطابق ہے، کہ بغیر اسے درج کیے رہا نہیں جاتا، اصل حدیث کسی قدر طویل ہے اس لیے یہاں صرف اس کے ملخص ترجمہ پر اکتفا کی جاتی ہے۔

"ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قیامت برپا ہونے سے پیشتر ایسے فتنہ و فساد برپا ہوں گے کہ گویا شب تار کی ظلمت چھا جائے گی، یہاں تک کہ جو شخص اُن میں صبح کو مومن ہوگا وہ شام کو کافر ہو جائے گا اور جو شام کو مومن ہوگا وہ صبح کو کافر ہو جائے گا اس وقت بیٹھا ہوا شخص بہتر ہوگا کھڑے ہونے والے سے اور چلنے والا بہتر ہوگا دوڑنے والے سے، اس وقت اپنی کمانوں کو توڑ ڈالنا چلّوں کو کاٹ ڈالنا اور تلواروں کو پتھر پر دے مارنا تاکہ بیکار ہو جائیں، اس وقت اگر کوئی شخص تمھارے اوپر حملہ کر رہا ہو تو تمھیں چاہیے کہ آدم کے دونوں فرزندوں میں سے بہتر کی تقلید کرو" (ابو داؤد و ترمذی باب الفتن)

جو مذہب اپنے پیرؤوں کے سامنے یہ بلند ترین، یہ حیرت انگیز نمونہ صبر و ایثار کا
پیش کرتا ہی، اس کو چنگیز و ہلاکو کا مذہب سمجھنا کسی صحیح الحواس کا کام ہو سکتا ہے؟
آج ہندوستان میں مہاتما گاندھی کے اصول ستیہ گرہ کی دھوم مچی ہوئی ہے
اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تحریک موجودہ دنیائے اخلاق، معاشرت و سیاسیات میں
مفید ترین انقلابات پیدا کر سکتی ہو، لیکن کیا یہ تحریک جدید ہی۔
اس مسلک کے عناصر ترکیبی جو خود مہاتما گاندھی نے بتائے ہیں حسب ذیل ہیں
۱- حق پر پوری طرح استقامت ہو، دنیا کا کوئی خوف، کوئی طمع، کوئی توقع، کوئی
اندیشہ کوئی رشوت، جادۂ حق کی راہروی میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔
۲- اعمال میں درشتی، اقوال میں خشونت اور دل میں غیظ و غضب کا شائبہ
تک نہ ہو۔
۳- شدائد پر برداشت پوری خندہ روئی اور کامل خلوص کے ساتھ کی جائے
لیکن اسلام کی تعلیم جو اوپر بیان ہوئی، وہ کیا اس سے ایک ذرہ بھی مختلف
ہی، اصل یہ ہی کہ آج جسے ستیاگرہ کے نام سے پکارا جاتا ہی، اس کے لیے اسلام میں
ایک جامع و مختصر اصطلاح "صبر" کی ہی، جس کے تحت میں وہ پورا سطح اخلاق
آجاتا ہی، جسے ستیہ گرہ کہتے ہیں اور یہ اصول آج کا پیدا کیا ہوا نہیں، یہ وہ اصول ہے
جس کی منادی پوری قوت و جامعیت کے ساتھ تیرہ سو برس پیشتر ہو چکی ہی جس پر عملدرآمد
کا ایک واضح ترین نمونہ تیرہ سال کے قیام مکہ میں اور تین برس کی مدت تک شعب
ابوطالب میں محصور رہ کر خود شہنشاہ کونین صلعم کی سیرت مبارک ہی جس پر حضرت عیسیٰ
حضرت ابراہیم وغیرہ متعدد انبیاء اصل کا عمل رہا ہی اور جس کا سب سے پہلا اور مکمل
نمونہ حضرت آدم کے سعید و رشید فرزند ہابیل نے اپنی جان دیکر پیش کیا تھا۔
ان تصریحات کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہی کہ ستیاگرہ دیا صبر

ی تعلیم در اصل اسی نغمۂ ازل کی ایک صدائے بازگشت ہو جو ابدالاباد سے مطرب
سطرات کے سازِ ہدایت سے نکل رہا ہو، اور گاندھی جی نے جام و صراحی اگرچہ جدید
یش کیا ہو لیکن یہ بادۂ دیرینہ ساقی کوثر ہی کا عطیہ ہو۔

ساقی بیا کہ عشق ندامی کند بلند

کانکس کہ گفت قصۂ ما ہم زما شنید

ان کی صدائے صبر و عدم تشدد جو آج بعض کانوں کو نامانوس معلوم ہو رہی
ہو، اس کا اصل باعث یہ ہو کہ ہم خود اپنے سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

اس سے انکار نہیں، کہ اسلام نے بعض مخصوص صورتوں میں قتال کو نہ صرف جائز بلکہ
جب قرار دیا ہو، کلام مجید میں فضائل غزوہ و قتال بیسیوں مقامات پر بیان ہوئے ہیں
ضیت قتال کی جا بجا تصریحات ہیں، سرور کائنات صلعم نے بہ نفس نفیس بارہا جہاد میں شرکت
ہنمائی فرمائی ہی، لیکن یہ احکام و فرائض ایسے مخصوص حالات سے متعلق ہیں اور ایسے
م و سخت شرائط سے مقید ہیں، جن کا وجود میں آنا زمانۂ موجودہ میں نہایت دشوار
ر آتا ہو ان شرائط و حالات پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں اشارۃً تین اہم
ائط کا ذکر کافی ہوگا۔

(۱) صبر و عدم تشدد کی تمام تدابیر استعمال میں آ چکی ہوں، اور سب کی ناکامی واضح ہو گئی ہو

(۲) حالت جنگ و انتقام میں بھی حدود و انصاف سے کسی طرح تجاوز نہ کیا جائے

وَلَا تَعۡتَدُوا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡن ۔ (بقرع ۲۴)

(۳) قتال کا مقصد حصول جاہ و ملک نہ ہو بلکہ محض دفاع جور و ستم ہو،

والفتنۃ اشد من القتل ... وقٰتِلُوھم حتّٰی تکون فتنۃ (بقرع ۲۴)

وَصَدٌّ عَنۡ سبیل اللہ وَکُفۡرٌۢ بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ
اکبر عند اللہ والفتنۃ اکبر من القتل (بقرع ۲۰)

(۴) نیت میں نفسانیت وعلو فی الارض نہ ہو بلکہ محض خدمت راہ حق ہو،

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم

خلوص نیت اور خالصتہً اطاعت امر حق کی شرط اس زمانہ میں عنقا ہو۔ یہی وہ شرط ہو جو اسلامی جہاد ولی اور دنیا کے عام جدال وقتال کے درمیان آسمان وزمین کی نسبت پیدا کئے ہوئے ہو۔ اسی خصوصیت جہاد اسلامی کی ترجمانی مولانا رومیؒ نے جناب امیر علیہ السلام کی زبان سے ان الفاظ میں کی ہو ے

گفت من تیغ از پے حق می زنم — بندۂ حقم نہ مامور تنم

من چو تیغ دان زندہ آفتاب — مارمیت اذ رمیت در حراب

من چو تیغم بر گہر ہائے وصال — زندہ گر دانم نہ کشتہ در قتال

بخل من للہ عطا للہ وبس — جملہ للہ ام نیم من آن کس

تو نگار ید کف مولیتی — بر زجاجۂ دوست سنگ دشمنی

(مثنوی دفتر اول، حکایت آخر)

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہو کہ اس میں ہر موقع اور ہر صورت کے مناسب الگ الگ احکام موجود ہیں۔ بعض مخصوص مواقع وحالات بے شبہ ایسے آپڑتے ہیں، جن میں بجز قتال کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا، اور جن کی تفصیل بجائے خود ایک مستقل تالیف کی محتاج ہو۔ لیکن دنیا کے عام حالات سے متعلق امن وصبر کے وہی احکام ہیں جن کی تصریح اوراق بالا میں گزر چکی۔

ضمیمہ اوّل

اعداد نقصانات جنگ عظیم

گزشتہ جنگ یورپ میں کل دنیا نے جان و مال کا جس قدر نقصان اٹھایا، اسی کے بابتہ صحیح اعداد اب تک کہیں تیار نہیں ہو سکے ہیں اور شاید تیار ہو سکتے بھی نہیں۔ البتہ امریکہ کے بعض ماہرین علم الاعداد نے ان ممالک کے جو براہ راست فریق جنگ تھے۔ مقتولین و مجروحین شدید کا ایک تخمینہ تیار کیا ہو، جس سے کل اتلاف جان و مال کے اندازہ کرنے میں کچھ مدد ملے گی، یہ واضح رہے، کہ فہرست ذیل میں مقتولین سے مراد صرف انھیں نفوس سے ہو جن کی براہ راست ہلاکت کا قطعی علم ہو چکا ہو، مفقودالخبر وغیرہ اس عنوان میں شامل نہیں، اور نہ وہ مرنے والے شامل ہیں، جو اگرچہ جنگ میں براہ راست نہیں کام آئے تاہم ان کی موت و ہلاکت کا سبب اثرات جنگ ہی ہوئے علی ہذا مجروحین کی فہرست میں وہ لوگ داخل نہیں، جن کے زخم نسبتہً خفیف سمجھے گئے حالانکہ بہت بڑی تعداد انھیں لوگوں کی تھی، ان تصریحات سے معلوم ہوگا، کہ تخمینۂ ذیل تخمینۂ اقلیت ہو، اور مقتولین، و مجروحین کی اصل تعداد اعداد ذیل سے نہ صرف زائد بلکہ بدرجہا زائد ہو!

فریق اوّل

ملک	مقتولین معلوم	مجروحین شدید
روس	۱۷۶۲۰۶۴	۱۰۰۰۰۰۰
فرانس	۱۴۲۷۸۰۰	۷۰۰۰۰۰
برطانیہ	۸۰۷۴۵۱	۶۱۷۷۴۰
سرویا	۷۰۷۳۴۳	۳۲۲۰۰۰

اٹلی	۵۰۷۱۶۰	۵۰۰۰۰
رومانیا	۳۳۹۱۱۷	۲۰۰۰۰۰
بلجیم	۲۶۷۰۰۰	۴۰۰۰۰
امریکہ	۱۱۷۱۵۱	۴۳۰۰۰
یونان	۱۵۰۰۰	۱۰۰۰۰
پرتگال	۴۰۰۰	۵۰۰۰
جاپان	۳۰۰	۴۰۰
میزان فریق اول	۵۹۵۴۳۸۶	۳۴۳۸۱۴۰
	فریق دوم	
جرمنی	۱۶۱۱۱۰۴	۱۶۰۰۰۰۰
آسٹریا	۹۱۱۰۰۰	۸۵۰۰۰۰
ٹرکی	۴۳۶۹۷۴	۱۰۷۷۷۲
بلگیریا	۱۱۰۱۲۲۴	۳۰۰۰۰۰
میزان فریق دوم	۳۰۶۰۳۰۲	۲۸۵۷۷۷۲
مجموعی میزان فریقین	مقتولین	۹۰۱۳۶۸۸
	مجروحین شدید	۶۲۹۵۹۱۲

نقشہ بالا میں برطانیہ کے مقتولین کی تعداد ۸۰۷۴۵۱ اور مجروحین شدید کی ۲۱۷۷۴۰۴ دی گئی ہے لیکن خود برطانیہ کے سرکاری اعداد کے بموجب (جس کا اعلان ۲۵ مارچ ۱۹۲۱ء کو ایوان دار العوام لندن میں کیا گیا) مقتولین کی تعداد بقدر ۶۰ ہزار کے زائد یعنی ۸۶۷۹۵۵ اور کل مجروحین کی تعداد اعداد نقشہ بالا سے کئی گنی زائد یعنی ۲۰۶۰۹۸۵ تھی، یہ سرکاری اعداد بمقابلہ سابق الذکر کے بہرحال زیادہ مستند ہیں۔ اسی طرح غالباً تخمینہ کے ہر عنوان میں نقصان کو ہلکا کیا ہے

دکھایا گیا ہے۔ پس برطانیہ کی مثال پر قیاس کرکے کہہ سکتے ہیں، کہ مقتولین و مجروحین جنگ کی کل میزان حقیقتہً اس سے بدرجہا زائد ہے جتنی تخمینۂ بالا میں مندرج ہے۔

یہ ان نقصانات جان کا اندازہ تھا، جو جنگ سے براہِ راست وقوع میں آئے باقی جنگ کے بالواسطہ جو اثرات مترتب ہوئے، مثلاً ہر ملک میں گرانی اشیاء بعض خطوں میں قحط امراض وبائی وغیرہ اور ان سے جس قدر اتلاف نفوس ہوا، اس کے اعداد ہر تخمینہ و اندازہ سے فزوں تر ہیں۔

ایک محقق نے حساب کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) سے لے کر جنگ بلقان (۱۹۱۳ء) تک سوا سو برس کی مدت کے درمیان جتنے نفوس کل جنگوں میں ہلاک ہوئے ہیں، ان کی دو چند سے زائد تعداد اس ساڑھے چار سال کے عرصہ میں جنگ یورپ میں کام آئی ہے۔

یہ اتلاف نفوس کا پہلو تھا، مالی نقصانات کے لحاظ سے مختلف ماہرین نے مختلف تخمینہ تیار کیے ہیں ذیل میں دو تین درج کیے جاتے ہیں!

(۱) پروفیسر بوگارٹ (ایسوسی یونیورسٹی امریکہ)

۱۸۶۳۳۳۶۳۷۰۹۷ ڈالر

(۲) مسٹر بیکر (ایک امریکی محقق) ۱۹۷۰۰۰۰۰۰۰۰ "

(۳) مسٹر اڈگر کریمنڈ (ایک انگریز محقق) ۲۱۰۱۷۵۰۰۰۰۰ "

(ایک ڈالر تقریباً ۴½ شلنگ کے مساوی ہوتا ہے)

تمام دنیا کا نظام معیشت جو جنگ کے بالواسطہ اثرات سے برباد ہوگیا، اسکے نقصان کو اعداد کے ذریعہ سے پیش کرنا کسی انسانی دماغ کے بس کی بات نہیں۔

ضمیمہ دوم

یورپ میں بے روزگاری

جنگ کے جو بالواسطہ اثرات نظام معیشت پر پڑے، ان کا ایک نمایاں مظہر یہ ہے کہ کاروباری یورپ میں بے روزگاری کی ایک ہوا چل گئی ہے صدہا کارخانہ ٹوٹ گئے ہیں اور لکھا کھا مخلوق جس کا واحد ذریعۂ معاش ان کارخانوں میں مزدوری کرنا تھی اب بالکل بے روزگار پھر رہی ہیں، اور حکومت کے خلاف سخت سے سخت مظاہرہ کرتے رہتے ہیں جنگ کی یہ ضرب سب سے سخت برطانیہ کے جسم پر پڑی ہے، اعداد ذیل سے جس کا حساب یکم نومبر سنہ ۱۹۲۲ء کو لگایا گیا، مختلف متمدن ممالک میں بے روزگار افراد کی تعداد کا اندازہ ہوگا،

۱-	ہالینڈ	۲۶۳۹۵
۲-	سویڈن	۳۷۳۰۰
۳-	سوئزرلینڈ	۴۸۲۱۸
۴-	فرانس	۱۱۸۵۶
۵-	بلجیم	۲۷۱۱۰
۶-	جرمنی	۱۱۳۲۳۱
۷-	برطانیہ	۱۴۳۷۰۰۰

ہالینڈ، سوئزرلینڈ، و سویڈن، شرکت جنگ سے الگ رہے تھے تاہم اختلال نظام معیشت کا اثر متعدی ہو کر ان تک بھی پہنچا۔

ضمیمہ سوم

مصارف تصفیہ صلح

ہماری زبان میں ایک مشہور کہاوت ہے "بیاہ کا بیچھا بھاری ہے" اس کی پوری مصداق حالت بعد جنگ ہوتی ہے، یعنی جب لڑنے اور لڑانے سے عاجز آکر بازی سیاست کے نامور آزمودہ کار کھلاڑی "صلح کانفرنس" کی گول میز پر بیٹھتے ہیں تو محض گفتگو کے مصاحت کے مصارف اتنے ہوتے ہیں کہ اگر ان کا بار کسی ایک سلطنت پر پڑے تو یقیناً رعایا پر ایک مخصوص ٹیکس اضافہ کرنے کی ضرورت پڑ جائے چنانچہ جنوری ١٩٢٢ء میں پیرس میں جو صلح کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کے مجموعی مصارف ١٠٤٧٧٦٠٠ روپیہ (یعنی ایک کروڑ سے زائد) ہوئے اور پھر صلح کانفرنس ایک نہیں ہوتی، کانفرنسوں کا ایک پورا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

١٩٢٢ء میں مسٹر ہلٹن ینگ سکریٹری خزانہ برطانیہ نے پارلیمنٹ میں بیان کیا کہ مختلف کانفرنسوں کے مصارف کا حسب ذیل حصہ سرکار برطانیہ کے حصہ میں پڑتا رہا ہو ١؎

سین ریمو کانفرنس	(تقریباً)	١٢٧٦٥	روپیہ
بولون کانفرنس	″	٥٦٢٥	″
بروسیلز ″	″	٣٥٤٠٠	″
لین ″	″	٢١٤٥	″
لیسکے ″	″	٤٨٩٠	″

١؎ اصل حساب کے سکہ انگریزی میں تھا، یہاں شلنگ وغیرہ کو حذف کرکے صرف پاؤنڈوں کو روپیہ میں تبدیل کردیا گیا ہے۔

پیرس (جنوری سنہ ۱۹۲۳ء) کانفرنس	(تقریباً)	۴۸۹۰	روپیہ
ہائیتھ کانفرنس	" "	۱۳۲۷۰	"
پیرس (جنوری سنہ ۱۹۲۲ء)	" "	۵۲۶	"